آثارِ انیس

نوشتہ

ڈاکٹر سید قمقام حسین جعفری

محترم کمال اظہر صاحب
کے ذوق سلیم
کی نذر
پیش کردہ
سید قمقام حسین جعفری
۵ جنوری ۱۹۷۶ء

انیس مرحوم کی صد سالہ برسی پر

پیر محمد ابراہیم ٹرسٹ کراچی

کی

قابلِ قدر پیش کش

آثارِ انیس

نوشتہ

ڈاکٹر سید قمقام حسین جعفری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدا کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو بڑا مہربان رحم والا ہے

(i) اور یہ (مشرکین) جن کی اللہ کے سوا (خدا سمجھ کر) عبادت کرتے ہیں انہیں تم برا نہ کہا کرو ورنہ یہ لوگ بھی خدا کو بے سمجھے عداوت سے برا بھلا کہہ بیٹھیں گے۔ ط (۶:۱۰۸)

(ii) دین میں کسی طرح کی زبردستی نہیں۔ (۲:۲۵۶)

(iii) اور خدا کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور (نافرمانی سے) بچے رہو اس پر بھی اگر تم نے (حکم خدا سے) منہ پھیرا تو سمجھ رکھو کہ ہمارے رسول پر بس صاف صاف پیغام پہونچا دینا فرض ہے۔ (۵:۹۲)

(iv) اپنے پروردگار کی راہ پر حکمت اور اچھی اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلاؤ۔ اور بحث و مباحثہ کرو بھی تو اس طریقہ سے جو (لوگوں کے نزدیک) سب سے اچھا ہو (ط) (۱۶:۱۲۵)

(v) سب (ملکر) خدا کی رسّی مضبوطی سے تھامے رہو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو (ص) (۳:۱۰۳)

(vi) اسمیں شک نہیں کہ میں ہی وہ اللہ ہوں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کیلئے نماز (برابر) پڑھا کرو ٥ (۲۰:۱۴)

(vii) (اے رسول) جو کتاب تمھارے پاس نازل کی گئی ہے اسکی تلاوت کرو اور پابندی سے نماز پڑھو۔ بیشک نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے باز رکھتی ہے اور خدا کی یاد یقینی بڑا مرتبہ رکھتی ہے۔ اور تم لوگ جو کچھ کرتے ہو خدا اس سے واقف ہے ٥ (۲۹:۴۵)

(viii) اے بیٹا نماز پابندی سے پڑھا کرو اور (لوگوں سے) اچھا کام کرنے کو کہو اور بُرے کاموں سے روکو اور جو مصیبت تم پر پڑے اس پر صبر کرو (کیونکہ) بے شک یہ (بڑی) ہمت کا کام ہے ٥ (۳۱:۱۷)

فہرست

۱ — پیش لفظ —— ۳

۲ — مقدمہ —— حضرت نسیم امروہوی —— ۴

۳ — نقادانِ انیس —— ۶

۴ — شاگردانِ انیس کا ایک جائزہ —— ۳۷

۵ — مرثیہ اور میر نفیس —— ۴۴

۶ — فارغ کی رزمیہ شاعری —— ۷۸

۷ — وقار کے مراثی پر ایک نظر —— ۱۱۴

اشاعت اوّل —— جنوری ۱۹۷۴ء

تعداد —— ایک ہزار دو سو پچاس

ہدیہ —— دو روپے پچاس پیسے

مطبع —— ایجوکیشنل پریس، کراچی

ناشر —— پیر محمد ابراہیم ٹرسٹ

۳۶۲ سراج الدولہ روڈ

بہادر آباد ہاؤسنگ سوسائٹی

کراچی ۵

پیش لفظ

پیر محمد ابراہیم ٹرسٹ کراچی کی پیش کش (انتخاب میر انیس) کی مقبولیت کا یہ ادنی ثبوت ہے کہ جون ۱۹۶۳ء سے جولائی ۱۹۷۳ء تک اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ارباب ذوق نے بھی اس انتخاب کو سراہا اور ذاکرین امام حسین علیہ السلام نے بھی مختصر مجالس کے لئے اسے بہت پسند کیا۔

انیس مرحوم کی صد سالہ برسی کی تقریب پر ملک میں بہت سے رسالوں اور اخباروں نے انیس نمبر شائع کئے، ان میں سے بعض بہت مقبول ہوئے اسی ضمن میں ٹرسٹ کی دوسری پیش کش (آثارِ انیس) حاضر خدمت ہے جس میں انیس کے نقادوں کے مختلف نظریئے پیش کئے گئے ہیں ان کے شاگردوں کا ایک جائزہ ہے اور ان کے چند مایہ ناز تلامذہ کے مرثیوں پر تبصرہ ہے۔

امید ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں میں بھی اسے پسند کیا جائے گا۔

پیر محمد ابراہیم ٹرسٹ
۳۶۳ سراج الدولہ روڈ
بہادر آباد سوسائٹی
کراچی ۵

مُقدّمہ

٭ ٭ ٭

ڈاکٹر سیّد تمقام حسین جعفری تحقیق کے میدان میں نو وارد نہیں ہیں "اردو شہر آشوب" کے ضمن میں ان کے مضامین اردو کے مختلف رسائل میں شائع ہوکر اربابِ ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان مضامین کا مجموعہ جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے عنقریب کتابی صورت میں شائع ہوگا۔

زیرِ نظر کتابچے میں "آثارِ انیسؔ" کے کُل مقالے میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھے، ان میں بڑی حد تک جدت اور ندرت، انداز بیان میں شگفتگی اور طرز ادا میں دلکشی اور رعنائی پائی جاتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ میر انیسؔ کی صد سالہ برسی کی تقریب کے موقع پر انیسؔ سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا پھر بھی بہت سے ایسے گوشے ہیں جو ابھی توجہ کے محتاج ہیں۔

تنقید کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر جعفری نے نقادانِ انیسؔ کا حصہ نہایت محنت اور کوشش سے لکھا ہے۔ مختلف مرثیوں کے برمحل حوالوں سے اس کی افادیت میں کافی اضافہ ہو گیا ہے میرا خیال ہے کہ اس کا بغور مطالعہ انیسؔ کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں خضرِ راہ ثابت ہوگا۔ نقادانِ انیسؔ کی تنقیدوں سے موافقت یا مخالفت نہایت جچے تلے الفاظ میں کی گئی ہے جس سے مضمون نگار کے ذوقِ سلیم کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

میرے علم میں شاگردانِ انیسؔ پر ہندوستان یا پاکستان میں اب تک کوئی کام نہیں ہوا۔ ڈاکٹر جعفری نے شاگردانِ انیسؔ کا جائزہ بڑی کاوش سے پیش کیا ہے ممکن ہے

مزید تحقیق سے انیسؔ کے شاگردوں میں اضافہ کیا جا سکے۔ مضمون کا یہ حصہ تحقیق کا ایک اعلیٰ کارنامہ ہے جس سے تاریخِ ادب میں ایک مفید اضافہ ہوگا۔

ڈاکٹر جعفری نے انیسؔ مرحوم کے صرف تین ایسے شاگردوں کے مرثیوں پر تبصرہ کیا ہے جن پر بہت کم لکھا گیا ہے مرثیہ اور میر نفیسؔ میں مرثیہ کی ابتدا۔ ارتقا۔ اس کے اجزائے ترکیبی اور تکنیک پر روشنی ڈالی گئی ہے نفیسؔ مرحوم کے مقبول مرثیوں سے چیدہ چیدہ بند پیش کئے گئے ہیں جن کو پڑھ کر ان کے کلام کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

عام طور پر یہی مشہور ہے کہ ساقی نامہ کی ایجاد کا سہرا نفیسؔ کے سر ہے لیکن بعض نقادوں کا خیال ہے کہ مرزا دبیرؔ کے شاگرد مشیرؔ ساقی نامہ کے موجد ہیں میں ڈاکٹر جعفری کی اس رائے سے متفق ہوں کہ نفیسؔ نے اپنے (باپ کی رہنمائی سے) اس گوشے کو دوسروں سے پہلے وسعت دی اور مرثیے کے قوام میں ایک اور لذّت پیدا کر دی۔

انیسؔ کے ایک مایۂ ناز شاگرد فارغؔ بھی تھے اس مقام پر ان کی رزمیہ شاعری سے متعلق بھی چند جملے لکھنے کو دل چاہتا ہے فارغؔ کی رزمیہ شاعری انیسؔ ہی کی رزمیہ شاعری کا رنگ لئے ہوئے اور انہی سے ماخوذ ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ تشبیہات۔ استعارات اور صنائع و بدائع کی لمر اور فنون جنگ کے وسیع تر مناظر پیش کرنے سے انھوں نے اس صنف کو دلچسپ سے دلچسپ تر بنا دیا ہے جسے پڑھ کر بے ساختہ ان کی پروازِ تخیل کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

وفاؔ بھی انیسؔ کے شاگرد تھے لیکن ان کو دنیائے ادب سے روشناس کرانے کی خاطر خواہ کوشش نہیں کی گئی انھوں نے بھی اُستاد سے خوب خوب استفادہ کیا اور اپنے زمانے کے ایک کامیاب مرثیہ گو تھے اگر ان کا کلام بستے سے نکل کر منظرِ عام پر آتا تو یقیناً مرثیہ گویوں کی صنف میں نمایاں مقام پاتے۔

ڈاکٹر جعفری سے ہماری خواہش ہے کہ وہ وفاؔ اور ان کے علاوہ سادات بارہہ کے ریاضؔ کا کلام جمع کریں اور رثا ہی انیسؔ کے اور شاگردوں کی بھی جستجو کرتے رہیں تو یقیناً وہ قابل قدر خدمت انجام دینگے۔

نسیم امروہوی

۲۲ جنوری ۱۹۷۴ء

نقادانِ انیس

تنقید ایک فن ہے لیکن نہایت مشکل۔ نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ فنِ تنقید کے اصولوں سے واقف ہو۔ اس کا مطالعہ وسیع ہونا چاہیئے اپنی زبان کے شاہکاروں کا اسے علم ہو اور نکتہ فہم بھی ہونا چاہیئے۔

اردو زبان میں فنِ تنقید انگریزی زبان کے فنِ تنقید کا رہین منت ہے حالانکہ یہ صریحی بات ہے کہ مغربی تنقید نگاری کے اصولوں سے مشرقی شاعری کو نہیں پرکھا جاسکتا۔ جس طرح مغربی زبان کی اقسامِ نظم سے موافقت نہیں رکھتیں اسی طرح تنقیدی اصول دونوں کے ایک دوسرے کے موافق نہیں ہوسکتے اس بدیہی فرق کے باوجود بعض اہل قلم نے مرثیے کے جائزے میں سختی کے ساتھ مغربی اصول مدنظر رکھے ہیں۔ ہر شخص واقف ہے کہ مرثیہ گوئی خالص مشرقی چیز ہے۔ فارسی مرثیہ گوئی سے قطع نظر کیوں کہ اسکا تعلق ایران سے ہے اردو میں اس کا آغاز دکن سے ہوا جس نے شمالی ہند آنے کے بعد ترقی کے مدارج طے کئے اور میر خلیق وضمیر اور میر انیس ودبیر نے اس کو وہ تنوع بخشا کہ آج اس کی ہیئت قدیم دکنی مرثیوں سے قطعی مختلف نظر آتی ہے۔ مرثیہ کے محاسن سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ زاویہ نگاہ درست کیا جائے اور ذوق سلیم کو خضرِ طریقت بنایا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ "سالک" کہیں "مقامات" میں کھو نہ جائے۔

اہل ادب واقف ہیں کہ اردو میں تنقید کا آغاز محمد حسین آزاد کے قلم سے ہوا۔

لیکن اس بنیاد پر رفیع الشان عمارت حالی نے استوار کی "پرانی تنقید جو محذوف و مقصود* کے جھگڑوں زبان و محاورات کی صحت اسناد کی ہنگامہ آرائی تک محدود تھی حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کی اور بنیادی اصول پر غور و فکر کیا شعر و شاعری کی ماہیت پر کچھ روشنی ڈالی اور مغربی خیالات سے استفادہ کیا اپنے زمانے اپنے ماحول اپنے حدود میں حالی نے جو کچھ کیا وہ بہت تعریف کی بات ہے وہ اردو تنقید کے بانی بھی اور اردو کے بہترین نقاد بھی ہیں" ۱؎

انیسویں صدی کے وسط تک اردو کے جو تذکرے لکھے گئے وہ فارسی زبان میں تھے اردو زبان میں سب سے پہلے انیس پر تنقید آزاد کے مشہور تذکرے "آب حیات" میں ملتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اس وقت (۱۸۸۰ء) تک انیس برصغیر میں کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔

"میر انیس صاحب صفائی کلام، لطف زبان، چاشنی، محاورہ، خوبی بندش، حسن اسلوب، مناسبت مقام، طرز ادا اور سلسلہ کی ترتیب میں جواب نہیں رکھتے اور یہی رعایتیں ان کی کم گوئی کا سبب تھیں۔" ۲؎

مولانا آزاد کی تنقید کے آخری ٹکڑے سے اختلاف کی کافی گنجائش ہے یہ صداقت پر مبنی نہیں کہ "یہی رعایتیں ان کی کم گوئی کا سبب تھیں"، درحقیقت ان پر کم گوئی کا الزام ہی بے بنیاد ہے۔ مشہور ہے کہ انیس مرحوم نے دو لاکھ سے زائد اشعار کہے ہیں ان کے کچھ مرثیے ایسے بھی ہیں جو اب تک زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکے۔

۱؎ کلیم الدین احمد "اردو تنقید پر ایک نظر"، بار اول، مطبع نامی پریس لاہور ناشر عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، جون، ۱۹۶۵ء، ص ۸۷

۲؎ آزاد محمد حسین "آب حیات" مطبع نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس لاہور ۱۹۵۷ء صفحہ ۵۱۷۔

* مقصود

حالی نے مرثیہ اور میر انیس پر جو تنقید کی ملاحظہ فرمایئے اس کے الفاظ یہ ہیں:

"میر انیس نے کہ باوجود خداداد مناسبت چار پشت سے شاعری اور مرثیہ گوئی ان کے خاندان میں چلی آتی تھی اس پر اردو زبان کے مالک تھے۔ اور لکھنؤ بنا ہوا تھا۔ اس طرز کو معراج کمال تک پہنچا دیا اردو شاعری میں جو کہ ماہ راکد کی طرح مدت سے بے حس وحرکت پڑی تھی تموج بلکہ تلاطم پیدا کر دیا"۔ ؎۱

یہ دو اقتباس تو ان حضرات کے تھے جنھوں نے بالاستیعاب اور بہ نظر تنقید دیکھا ہے. اب ایک ایسے ادیب کی رائے سنیے جسے اس میدان کا مرد نہیں کہہ سکتے۔ ہمارا مطلب غالب سے ہے. غالب نے اپنے زمانے کے لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر اظہار خیال کیا ہے۔

انھوں نے مجتہد العصر سید محمد صاحب کی فرمائش پر مرثیے کے تین بند ان کی خدمت میں روانہ کر دیئے اور لکھ دیا کہ:

"یہ تین بند صرف امتثال امر کے لئے لکھے ہیں ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں یہ ان لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس وادی میں عمریں بسر کی ہیں مجھ کو ان کے درجے تک پہنچنے کے لئے ایک دوسری عمر درکار ہے پس مجھے اس خدمت سے معذور و معاف رکھا جائے انکا قول تھا کہ ہندوستان میں انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ آئندہ ہو گا۔ ؎۲

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے تاثرات بھی انیس کی مرثیہ گوئی کے بارے میں بڑی

؎۱ حالی، خواجہ الطاف حسین، "مقدمہ شعر و شاعری" ناشر اردو اکیڈمی سندھ. کراچی باب الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۰

؎۲ حالی، "یادگار غالب"، مطبوعہ لاہور۔ ص ۱۰۱

اہمیت کے حامل ہیں :-

شمس العلماء حالی مرحوم کہ عرصہ تک ان کی (شیفتہ) مصاحبت میں تھے بیان کرتے تھے کہ ایک روز ان کی صحبت میں میر انیس کے مرثیہ کا ذکر آگیا وہ فرمانے لگے یوں تو وہ چار جلدوں کے مالک ہیں اور ان کے کلام کی داد نہیں دی جاسکتی مگر یہ بھی نہ ہو میں تو ان کا صرف یہ مصرعہ حق مرثیہ گوئی ادا کرنے کو کافی ہے اس وقت کی تصویر کھینچی گئی ہے جب امام حسین علیہ السلام بے مونس و غمخوار میدان کربلا میں رہ گئے تھے۔ ؎

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے" ا؎

مولانا شبلی جنھوں نے موازنہ انیس و دبیر لکھ کر ادبی دنیا میں تہلکہ مچادیا۔ میر انیس کی بابت یوں رقم طراز ہیں :-

"میر انیس کے مرثیوں میں واقعات اور کیفیات کی تصویر کھینچ دینے کی جو خصوصیت ہے دادا کی میراث ہے ....

میر انیس نے واقعہ نگاری اور مصوری کے ساتھ بندش کی اور خواص کی طرزِ گفتگو کی خصوصیت بھی قائم رکھی اور یہ قادر الکلامی کی انتہا ہے" ۲؎

مولانا شبلی نے انیس کی شاعری کی خصوصیات پر نہایت تفصیل سے بحث کی اور ان کے مرثیوں سے انتخاب بھی نہایت خوش اسلوبی سے کیا۔

آتش نے کن الفاظ میں انیس کی مرثیہ گوئی کو سراہا اس واقعہ کو امیر احمد علوی کی زبان سے سنیئے :-

"زوجہ میر ضمیر مرحوم کی چہلم کی مجلس میر انیس نے پڑھی تھی جس میں خواجہ حیدر علی آتش

ا؎ عرشی، ضمیر الدین، "حیات مومن" مطبوعہ دہلی، ۱۳۴۷ھ م ۱۹۲۸ء، ص ۶۷

۲؎ شبلی، مولانا، "موازنہ انیس دبیر" بار اوّل، مطبوعہ لاہور، ص ۲۹ - ۲۸

بھی موجود تھے۔ میر صاحب وہ مرثیہ پڑھ رہے تھے جس کا مطلع ہے :

"آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی"

تلوار کی تعریف کے سلسلے میں جب یہ بیت آئی :

اشراف کا بناؤ رئیسوں کی شان ہے

شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

اس وقت میر صاحب نے خواجہ آتش کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا کہ

"اس بیت کی داد آپ سے چاہتا ہوں"

خواجہ صاحب پہلے سے جھوم رہے تھے یہ بیت سن کر نصف قد کھڑے ہو گئے۔ اور بہ آواز بلند کہا "کہ کون بے وقوف کہتا ہے کہ تم محض مرثیہ گو ہو واللہ ثم باللہ تم شاعر ہو اور شاعری کا مقدس تاج تمہارے سر کے لئے موزوں ہے اللہ مبارک کرے" ؎۱

میر انیس نے ایک مجلس واجد علی شاہ کے ارشاد کے مطابق پڑھی جب وہ زیب منبر ہوئے تو وہ سلام پڑھا جس کا مطلع ہے :

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر

مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

سلام کے بعد مرثیہ پڑھا واجد علی شاہ نے دل کھول کر تعریف کی اور بعد مجلس فرمایا :۔ "کیوں فتح الدولہ میں نہ کہتا تھا کہ میر انیس لکھنؤ میں ایک ہی شاعر ہیں دیکھا تم نے یہ زبان انھیں کے لئے خاص ہے" ؎۲

یہاں مختصر الفاظ میں یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ناقدین انیس کی آرار کی

؎۱ امیر احمد علوی، "یادگار انیس" مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ، ۱۹۵۷ء ص ۳

؎۲ " " " " " " ص ۱۱۲

ترتیب میں اگرچہ موضوع کو مدنظر رکھا گیا ہے لیکن "لچک" کے ساتھ کہیں کہیں حسب ضرورت نقادوں کی تنقید سے اتفاق یا اختلاف بھی کیا گیا ہے باایں ہمہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

مصوری، منظر نگاری، جذبات نگاری اور رزمیہ شاعری کے بارے میں انیس کے مرثیوں سے نہایت اختصار کے ساتھ کچھ بند نقل کر دیئے ہیں تاکہ ناقدین کے مفہوم کی پوری طرح وضاحت ہو سکے۔

"انھوں (انیس) نے مرثیے کے محدود چوکھٹے میں جو تصویریں سجائی ہیں، جو رنگ آمیزی کی ہے اور صناعی کا جو کمال دکھایا ہے وہ براہ راست محض رونے رلانے کے لئے نہیں ہو سکتا یقیناً ان کے اندر وہ شاعرانہ اور خلاقانہ بصیرت تھی جو کسی صنف کی رسمی اور میکانکی حدوں کی پابند نہیں ہوتی بلکہ اپنے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے دائرے کو وسیع کرتی ہے۔" [۱]

"میر انیس کا سب سے بڑا کمال ان کی مصوری یا واقعہ نگاری ہے وہ انسانی کردار افعال چاہے وہ ساکن ہوں یا متحرک میدان جنگ کا نقشہ اور بزم کی گرما گرمی کی اس قدر صحیح تصویر اتار دیتے کہ بڑے سے بڑا مصور بھی اس پر حرف گیری نہیں کر سکتا مثال کے طور پر ایک بند ملاحظہ ہو۔ "کربلا سے دمشق کے راستے میں" میر انیس حضرت امام زین العابدینؑ کی حالت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:-

حلقے میں دل گدازوں [۲] کے وہ یوسف ثانی   تلواریں لئے چاروں طرف ظلم کے بانی

وہ طوق کا لنگر وہ سلاسل کی روانی   غربت الم، بے پدری، تشنہ دہانی [۳]

---

[۱] احتشام حسین، سید "مراثی انیس" جلد اول، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۹ء (مقدمہ) ص ۱۱

[۲] دل آزاروں

مڑ کر کبھی زینب کے رُخ پاک کو دیکھا
کو
بیڑی کبھی [illegible] کبھی افلاک کو دیکھا "۔ ۱؎

"میر انیس کی مرثیہ گوئی میں اس کی (یعنی منظر نگاری کی) بڑی اہمیت ہے یہ مرثیے کا وہ جزو ہے جس میں میر انیس صرف اپنے ہم عصروں ہی میں بہت بلند نظر نہیں آتے بلکہ انیس کے بعد آنے والوں میں بھی کوئی ایسا نہیں ہوا جو انیس کی منزل تک پہنچا ہو۔

منظر نگاری میں انھوں نے کسی سمان کو نہیں چھوڑا ہے...........

انیس کی منظر نگاری کبھی کبھی مرقع کشی ہو گئی ہے اور شاعر کے قلم اور مصور کے موقلم میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح
گلزار شب خزاں ہوئی آئی بہار صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثار صبح
سرگرم ذکرِ حق ہوئے طاعت گزار صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا ۲؎

"میر انیس کی منظر نگاری کے سلسلے میں مختصراً اگر یہ کہا جائے کہ ان کا ہر شعر ہر مصرع اور حتی کہ ہر لفظ ایک واضح صورت رکھتا ہے تو یہ غلط نہ ہوگا پھر بھی حسین کے نام لیوا کی وہ تصویریں نہایت اہم اور وقیع ہیں جن کا براہ راست سبطِ نبیؐ کے کسی مقدس عمل سے تعلق ہے۔ مصورِ غم کے مرقع غم سے میں ایک آخری تصویر اور پیش کروں گا یہ منظر ہم شکل مصطفیٰ ۳؎ کی شہادت کا منظر ہے اور ظاہر ہے کہ میر انیس نے اس تصویر میں

۱؎ محمود فاروقی "میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعراء" مطبوعہ راولپنڈی۔ ناشر پنجاب اینڈ فرنٹیر بک ڈپو، راولپنڈی، ص ۲۹۵

۲؎ سفارش حسین رضوی "اردو مرثیہ (تاریخ مرثیہ)" مطبوعہ دہلی، جولائی ۱۹۶۵ء ص ۳۲۰

۳؎ ہم شکل مصطفیٰ کی نہیں بلکہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا منظر ہے (ق۔ ح۔ جعفری)

خون جگر کا رنگ بھرا ہوگا :-

تھا عصر کا ہنگام کہ حضرت کو غش آیا !! سجدے میں سنبھل کر سرِ اقدس کو جھکایا
خنجر کو لعیں حلق کے نزدیک جو لایا زہرا کی صدا آئی کہ ہے ہے مرا جایا
قاتل کو تو کچھ منہ سے نہ فرماتی تھیں زہرا
فرزند سے ہر بار لپٹ جاتی تھی زہرا [1]

" انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے مرثیہ کے ہر جزو کو پوری پوری تاب و تواں بخشی ہے لیکن انیسؔ کا کمال ان جملہ عناصر مرثیہ ہی کے پیش کرنے پر موقوف نہیں بلکہ دراصل ان میں جوہر شعری سمونے میں ہے چنانچہ جس چیز کا وہ تذکرہ کرتے ہیں اس کی ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتے ہیں یہ شاعری کا اعجاز ہے کہ کسی شے کی منہ بولتی تصویر کھینچ دی جائے جو مصور کے موئے قلم کی دسترس سے بھی باہر ہو۔" [2]

" انیسؔ کا مطالعہ زبان میں لوچ، شستگی، حسن دیانت کا سبب ہے۔ اس سے مشاہدے کی قوت میں وسعت و گہرائی حاصل ہوتی ہے۔ نفسیات کے نکتے اجاگر ہوتے ہیں۔ احساسات میں توازن و جوش آتا ہے۔ اسلامی تاریخ سے ربط اور مجاہدۂ کربلا کے لئے بصیرت۔ عکاسی، تصویر کشی کے ماہرانہ خطوط، ثقافت اور تاریخ کے واضح مجسمے، تخیل و شاعری کے مثالی ارتقاء کو سمجھنے کے لئے مراثی انیسؔ کا مطالعہ ناگزیر ہے" [3]

---

[1] سرشار صدیقی "میر انیس کی منظر نگاری کے چند نادر نمونے" مطبوعہ روزنامہ "حریت" کراچی، عاشورہ ایڈیشن، ۹ مارچ ۱۹۷۱ء ص ۱۱

[2] افضال حسین، سید، مضمون "مرثیہ اور انیس"، مطبوعہ "نقوش" شمارہ بابت دسمبر ۱۹۷۰ء۔ ص ۱۷۷

[3] فاضل، مولانا سید مرتضےٰ حسین، "مقدمہ" "فکر انیس"، منظور علی علوی، بار سوم، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۹ -

"انیس کا کام فقط یہی نہیں کہ ہمیں اپنی طبع حساس کی نزاکتوں سے کام لے کر آہ و بکا پر آمادہ کرے بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اظہار کو شعری ابلاغ کی حسین ترین صورت دے اردو میں فطری مناظر کی تصویر کشی اتنی کم ہے کہ انیس کے کلام میں سے ایسے بندوں کا انتخاب نہ کرنا انیس پر اور اردو شاعری پر ظلم ہے۔ انیس اس معاملے میں اردو شعر کی آبرو ہیں انھوں نے ایسی نزاکت و نفاست سے مناظر کی تصویریں کھینچی ہیں کہ مصور کا موقلم ان کے آگے سر بسجدہ ہے۔" ؎۱

"میں سمجھتا ہوں کہ میر انیس کی شاعری کو دہلی یا لکھنؤ اسکول سے منسوب کرنا غلطی ہے کیونکہ انیس کو زبان دانی کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ وہ شاعر سے زیادہ کچھ اور بھی تھے اور اس سے کم تر درجہ کا فن کار کبھی یہ مرتبہ حاصل نہ کر سکتا تھا خواہ وہ لکھنؤ کا ہوتا یا دہلی کا۔" ؎۲

ڈاکٹر صاحب کے نقطہ نظر سے انیس مرحوم ایک فن کار تھے جنھوں نے واقعات کی مرقع کشی بھی فرمائی اور ماہر نفسیات کی حیثیت سے جذبات نگاری کے اعلیٰ نمونے مرثیوں میں پیش کئے۔

"انھوں نے اردو مرثیے میں انسانی نفسیات کو اس طرح سمویا ہے کہ پتھر سے پتھر دل انسان بھی کربلا کے اندوہناک المیہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کربلا کا المیہ مذہب و عقیدت سے ہٹ کر بھی انسانی کردار و اخلاق کا ایک ایسا سانحہ ہے جس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ میر انیس نے اس خون آشام ٹریجڈی کو جذبات نگاری

؎۱ عابد، سید عابد علی، "مقدمہ ثانی فکر انیس"، ص ۳۱۔۳۰

؎۲ احسن فاروقی، ڈاکٹر "اردو مرثیہ اور میر انیس"، مطبوعہ رسالہ "نگار" (اصناف شاعری نمبر) کراچی، سالنامہ، ۱۹۶۷ء، ص ۱۹۸۔

کا جو روپ دیا ہے وہ اردو شعر و ادب کے انمٹ نقوش ہیں جنھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔"[1]

انیس کی شاعری میں مصوری اور جذبات نگاری کے نمونے

مصور کا کمال یہ ہے کہ وہ ایسی تصویر بنا دے جو ہو بہو اصل کے مطابق ہو لیکن میر صاحب نے تصویر میں ایسے رنگ بھر دیئے کہ وہ اصل سے بڑھ گئی ان کی دعا مستجاب ہوئی کہ:

قلم فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ
شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ

میر صاحب کی مصوری کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں:

حضرت حبیب بن مظاہر سن رسیدہ بزرگ تھے یوم عاشورہ آپ امام حسینؑ کی رکاب میں پیدل تھے۔ انیس کے معجز نما قلم کی "مرقع کشی" کی داد دیجئے۔

ابرو جھکے جو پڑتے تھے آنکھوں پہ بار بار — رومال پھاڑ کر انھیں باندھا تھا استوار
آنکھوں سے شیر نر کی جلالت تھی آشکار — گویا کہ تھی غلاف میں حیدر کی ذوالفقار

جلدی چلے جو چند قدم جھوم جھوم کے
رعشہ وداع ہو گیا ہاتھوں کو چوم کے

بیت کی جس قدر تعریف کی جائے وہ کم ہے "سحر حلال" کی نادر مثال ہے۔ "رعشہ وداع ہو گیا ہاتھوں کو چوم کے" بار بار اس مصرع کو پڑھیے لطف اندوز ہونے کی کوشش کیجئے۔ انیس کے کمال شاعری میں جو شک لائے وہ کور ذوق تو ضرور

---

[1] مرتبہ نادم سیتاپوری، میر انیس (حالات زندگی اور انتخاب کلام) "پہلی بار، مطبوعہ فیروز سنز، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۴

کہا جائے گا۔

منظر کشی

انیسؔ کا جادو نگار قلم کیسے کیسے مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

عاشورہ کی صبح کا منظر

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمبدم — مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم — سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

تشبیہہ کی خوبی ہے معنی آفرینی۔ تشبیہہ کی جدت سے کلام میں چار چاند لگ جاتے ہیں ایسی تشبیہہ کی مثال شاید ہی دوسری زبانوں میں مل سکے۔ اور اس کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ میر صاحب کا کلام گوہرِ محیط فصاحت ہے اور ان کے دامن میں وہ گل ہیں جن پر ان سے پہلے کسی کو دسترس حاصل نہیں ہو سکی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی آخری قربانی کو ہاتھوں پر رکھ کر میدان کارزار میں قدم رنجہ فرماتے ہیں اس موقع کی مرقع کشی کس غضب کی ہے:

بچے کو لئے گھر سے جو نکلے شہِ والا — تھی دھوپ میں تیزی کہ ہرن ہوتا تھا کالا
نکلا تھا کبھی گھر سے نہ وہ ہنسلیوں والا — دامانِ عبا چہرہ فرزند پہ ڈالا
روتا تھا تو چھاتی سے لگا لیتے تھے شبیرؑ
ہر گام پہ دامن کی ہوا دیتے تھے شبیرؑ

جزئیات کی تفصیل کی وجہ سے مرقع کشی اور جذبات نگاری کا حسین امتزاج سہلِ ممتنع تعریف و توصیف سے بالاتر ہے۔

مظلوم امام کا کلام سن کر پتھر کے دل بھی پسیج گئے اور یہ حال ہو گیا۔

کی آہ کسی نے کوئی منہ پھیر کے رویا | دامن کسی جلاد نے اشکوں سے بھگویا
ہر شخص کے ایک تیر لگا قلب پہ گویا | بولا کوئی ایمان بھی گیا دین بھی کھویا

یوں پھول کوئی دھوپ میں مرجھا نہیں جاتا
بچے کا یہ عالم ہے کہ دیکھا نہیں جاتا

حضرت علی اصغرؑ حرملہ کے تیر سہ پیکر سے شہید ہوتے ہیں یہ سب سے کم سن مجاہد تھے

ننھی سی قبر کھود کے اصغر کو گاڑ کے
شبیرؑ اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

مرقع کشی اور جذبات نگاری نے انیسؔ کے کلام کو کس قدر عروج بخشا۔ جذبات نگاری کے بہت سے نمونے انیسؔ کے ہر مرثیے میں ملیں گے۔ حضرت علی اصغر کے بارے میں ایک بند اور نقل کیا جاتا ہے جس سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ میر صاحب کی داخلی شاعری ان کی شہرت کی کس حد تک ضامن ہے۔

حضرت امام حسینؑ فوج یزید سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ پانی مجھے لا دو | خود تم ہی اسے آن کے چلو سے پلا دو
مرتا ہے یہ مرتے ہوئے بچے کو جلا دو | للہ کلیجے کی مرے آگ بجھا دو

جب منہ مرا تکتا ہے یہ حسرت کی نظر سے
اے ظالمو اٹھتا ہے دھواں میرے جگر سے

منظر کشی اور جذبات نگاری میں انیسؔ کو ید طولیٰ حاصل تھا جب وہ بزم چھوڑ کر رزم کا بیان فرماتے تو ان کی طبع اولوالعزم خیبر کی خبر لاتی اور تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آتی جس کی جھنکار سامع و قاری کو بھی سنائی دیتی ہے۔

انیسؔ کی رزمیہ شاعری

انیسؔ کی رزمیہ شاعری کے بارے میں نقادانِ سخن کے جواہر پارے ملاحظہ فرمائیے

"میری دانست میں ہومر ایک بڑا رزمی شاعر تھا لیکن اگر ہومر سیر تھا تو میر صاحب سوا سیر تھے۔ اس افزونی کی وجہ یا یہ تھی کہ میر صاحب خود نفس شاعری میں ہومر سے زیادہ تھے یا یہ کہ میر صاحب کو سبجیکٹ (SUBJECT) یعنی شاعری کا موضوع ایک ایسا واقعہ بزرگ ہاتھ لگا کہ جس کا جواب دنیا میں نظر نہیں آتا ہے" ؎۱

"انیس کا مرثیہ حقیقت میں ایک خاص طرح کی رزمیہ نظم ہے جس کی ترکیب میں مرثیت کا عنصر لازمی طور پر موجود رہتا ہے اس نظم کا میدان مرثیے سے کہیں زیادہ وسیع ہے بلکہ معنوی حیثیت سے شعر کی جتنی قسمیں کی جاسکتی ہیں یہ ان سب پر حاوی ہے" ؎۲

"اردو ادب میں انیس کے رزمیہ مرثیوں کا جو مقام ہے اس کا تقابل کسی شاعر کے کلام سے کرنا کلام انیس کی توہین ہے حالانکہ ان مرثیوں کے ساتھ ظلم یہ ہوا کہ انھیں صرف مذہبی نظم سمجھ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے" ؎۳

"میر انیس کے کلام میں رزمیہ شاعری کی جملہ خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ انھوں نے اس صنف کلام کو وہ بلند درجہ دیا جہاں تک شاید ارسطو کا تصور بھی نہ پہنچ سکا تھا۔ وہ یقینی طور پر ارسطو کی شعریات (POETICS) سے بالکل ناآشنا تھے بلکہ شاید اس کا نام بھی انھوں نے نہ سنا ہوگا لیکن تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے باوجود ان کا سارا کلام رزمیہ کے اصول و قواعد سے آراستہ ہے جو باتیں ارسطو نے آج سے پہلے کئی

؎۱ اثر، امداد "کاشف الحقائق (معروف بہ بہارستانِ سخن)، مطبوعہ لاہور، جلد دوم، ص ۲۷۴

؎۲ مسعود حسن رضوی، پروفیسر سید، "روح انیس" مطبوعہ الہ آباد، ص ۱۵

؎۳ آہ، صفدر "فردوسی ہند" بمبئی، ناشر کتاب کدہ بمبئی ۱۹۵۸ء، ص ۱۰۹

ہزار برس رزمیہ شاعری کو پیش نظر رکھ کر ایپک کے لیے ضروری سمجھی تھیں وہ سب کی سب میر انیس کے کلام میں موجود ہیں۔ انھوں نے زیادہ سے زیادہ فردوسی کے شاہنامہ اور مہا بھارت اور رامائن کا مطالعہ کیا ہوگا لیکن اس پر کمال یہ ہے کہ انھوں نے بحیثیت رزم نگار شاعر کے دوسرے رزمیہ شاعروں کی محفل میں ایک بلند درجہ حاصل کیا۔[۱]

رزمیہ شاعری دراصل واقعہ نگاری کی ایک قسم ہے لیکن خالص رزمیہ مقامات کے بیان میں فکر کو حقیقت کی سطح سے بلند وارفع کرنا چاہیے۔ ملحوظ خاطر رہے کہ مبالغہ میں آمد۔ ندرت اور خلوص فکر ہو زور بھی ہو اور معنویت بھی تاکہ مبالغہ پر حقیقت کا دھوکا ہونے لگے۔ اعتقادی ادب میں تو اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ رزم ایسی ہے کہ سب کے دل پھڑک جاتے ہیں اور تیغوں کی بجلیاں آنکھوں میں چمک جاتی ہیں رزمیہ شاعری کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی جنگ کی ایک جھلک:

نکلی جو رن میں تیغ حسینی غلاف سے — اڑنے لگے شرر دم خارا شگاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشت مصاف سے — صاف آئی الامان کی صدا کوہ قاف سے

طبقے فلک کے صورت گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن سے مل گئے

کالے علم، نشان سیہ ~~کالے~~ کاری سپاہ — گویا زمیں کے سینے سے اٹھتا تھا دود آہ
تھا نالۂ نفیر کہ بے کس کو دو پناہ — شہنا کی یہ صدا تھی کہ سید ہے بے گناہ

سن کر دہل کا شور کلیجے دہلتے تھے
تھرا کے جھانجھ بھی کف افسوس ملتے تھے

---

[۱] اکبر حیدری، ڈاکٹر "میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر"، مطبوعہ: سرفراز قومی پریس لکھنؤ ناشر "ادبستان" سری نگر کشمیر، ۱۹۶۱ء، ص ۴۵

گرتی تھی ذوالفقار جو سَن سَن اِدھر اُدھر   دہشت سے چھپتے پھرتے تھے دشمن اِدھر اُدھر
کٹ کٹ کے گر رہے تھے سر و تن اِدھر اُدھر   ٹکڑے پڑے تھے خاک پہ جوشن اِدھر اُدھر
ڈر ڈر کے جو سوار گرے وہ مرے گرے
صف پر گری جو صف تو پروں پر پرے گرے

رزمیہ شاعری میں ہیرو کی تلوار کی تعریف کی جاتی ہے اس کے محاسن بتائے جاتے ہیں۔ انیس نے تشبیہات کی مدد سے تلوار کی جی کھول کر تعریف کی۔

آفت تھی، قہر تھی، غضب ذوالجلال تھی   بجلی تھی، صاعقہ تھی، فنا تھی، زوال تھی
خنجر تھی، نیمچہ تھی، کٹاری تھی، ڈھال تھی   اعدا کے ذبح کرنے کو سحرِ حلال تھی
جیتا تو سامنے سے کوئی کم نکل گیا
منہ اس کا جس نے دیکھ لیا دم نکل گیا

ایک بند اور ایک بیت رہوار کی تعریف میں سن لیجئے رزمیہ شاعری کا ایک جزو ہیرو کا رہوار بھی ہوتا ہے:

صرصر تھا گاہ گاہ نسیم سحری تھا   طاؤس فلک سیر دم جلوہ گری تھا
بن بن کے اٹھانے میں قدم کبک دری تھا   کاوے میں جو پرکار تو اڑنے میں پری تھا
رفتار تو کیا اپنی دکھاتا تھا کسی کو
سایہ بھی نہ اس کا نظر آتا تھا کسی کو

بیت بھی ملاحظہ ہو:

راکب نے سانس لی تو وہ کوسوں رواں تھا   تارِ نفس بھی اس کے لئے تازیانہ تھا

نہ رہوار کی سرعت اور تیزی کی انتہا ہے اور نہ انیس مرحوم کی جولانی طبع کا جواب ہے۔

رزمیہ شاعری نے اردو زبان کو لفظاً اور معناً دونوں حیثیتوں سے مالا مال کیا۔

انیس کی رزمیہ شاعری پر جس قدر فخر کیا جائے وہ کم ہے۔ نوجوانوں کے اخلاق کی تربیت ان میں جوش و ولولہ اور قومی و ملکی جذبہ پیدا کرنے کے لئے رزمیہ شاعری صحیح منزل کی نشاندہی کر سکتی ہے۔

"اردو شاعری کی ابتداء غالباً مراثی سے ہوئی اور میر انیس اور مرزا دبیر کے زمانے میں اس نے اس قدر وسعت حاصل کی کہ تمام اصناف شاعری کو محیط ہو گئی اس لئے ان میں خالص مرثیت کم پائی جاتی ہے۔"[1]

اس صنف کی داغ بیل دکن میں ڈالی گئی گولکنڈہ کے فرمانروا قلی قطب شاہ نے پانچ مرثیے لکھے جو مختلف بیاضوں میں ملتے ہیں[2] جب مرثیے نے ترقی کی تو اس کے موضوع میں تنوع پیدا ہوا مرثیے میں درد و غم کی باتیں بھی ہوتی ہیں جن کو بین کہا جاتا ہے اور یہی بین مرثیے کا مقصود بھی ہیں۔ بین کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ مرثیہ تمام اصناف شاعری پر محیط ہے۔ اس ضمن میں چند نقادوں کی آرا پیش کی جاتی ہیں:

"ان کا (انیس کا) پاکیزہ کلام بہترین اصناف سخن کا جامع ہے اس میں ڈراما بھی ہے اور ایپک بھی۔ تشبیب و غزل ہے اور رباعی و مسدس بھی۔ واقعہ نگاری ہے اور اظہار جذبات بھی۔ بلاغت کا انداز ہے اور فصاحت بھی۔ استعارات و تشبیہات ہیں اور صنائع و بدائع بھی۔ مناظر قدرت کے فوٹو ہیں اور خیال آفرینی بھی۔ فخر و خودستائی ہے اور عجز و انکسار بھی۔ رزم و بزم ہے اور اصلاح اخلاق بھی۔ محاورہ بندی اور روزمرہ ہے اور توازن و تناسب الفاظ بھی۔"[3]

---

[1] عبدالسلام ندوی، مولانا "شعر الہند" اعظم گڑھ، ص ۳۵۶

[2] قلی قطب شاہ کے مطبوعہ کلیات میں بھی ہیں۔ [3] امیر احمد علوی "یادگار انیس" ص ۲۰۱

"کہا جاتا ہے کہ آپ نے (انیسؔ نے) دو لاکھ سے زائد اشعار کہے ہیں اور مرثیہ گوئی میں مسلمہ طور پر سب سے افضل و برتر ہیں قادر الکلامی، فصاحت و بلاغت و ہمہ گیری اظہر من الشمس ہے، واقعہ نگاری، رزم و بزم، رجز، مناظر قدرت غرض کیا ہے جو آپ کے یہاں نہیں ہے سلام و رباعیات بھی بے نظیر ہیں سلام کے بعض اشعار ایسے ہیں جو غزل کی صنف میں بھی داخل ہو سکتے ہیں"۔ [۱]

"میر انیسؔ نے تقریباً دو لاکھ اشعار لکھے اور ان کا بہت سا ذخیرہ ادب اب بھی پردۂ خفا میں ہیں۔ لیکن جو کچھ موجود ہے وہ بھی دنیا کی بڑی سے بڑی نظموں کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے رزمیہ شاعری ہو یا المیہ واقعہ نگاری ہو یا جذبات نگاری۔ مصوری ہو یا مرقع نگاری، فصاحت ہو یا بلاغت، سادگی ہو یا سلاست، لفظی خوبی ہو یا معنوی حسن میر صاحب کو ہر ایک کے استعمال پر قدرت کاملہ حاصل ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کا برمحل استعمال الفاظ و تراکیب کی بہترین نشست روان اور مترنم بحریں ان کے کلام میں چار چاند لگاتی ہیں"۔ [۲]

"بے شک میر انیسؔ بھی پوری نوع انسانی کے شاعر ہیں لیکن وہ اس منزل تک کربلا کی قتل گاہ سے پہنچے ہیں، انیسؔ کی شاعری میں محبت، شرافت، صداقت، سرفروشی، ایثار حق، رحم، ظلم، شقاوت، باطل پرستی اور خود پرستی کے متضاد جذبات ایک خاص واقعہ کے تاثر سے مرتفع یا منتقل ہو کر آئے ہیں اور اس طرح ان کی حیثیت انفرادی سے زیادہ اجتماعی ہو گئی ہے اس لئے تاریخ ساز بھی"۔ [۳]

---

[۱] تنہا، محمد یحییٰ، "مرآۃ الشعراء" لاہور، عالمگیر الیکٹرک پریس، ۴۶-۱۹۴۵ء جلد اول ص ۴۴۶

[۲] شجاعت علی سندیلوی "تعارف مرثیہ" ادارہ انیس الہ آباد ص ۷۴

[۳] رئیس امروہوی، "انتخاب میر انیسؔ" "پیش گفتار" مئی ۱۹۶۳ء

اس صنف شاعری کی وجہ سے مسدس نے مقبولیت حاصل کی۔

"انیس و دبیر نے اپنی فن کاری سے یہ ثابت کر دیا کہ بیانیہ شاعری کے لئے اس سے بہتر کوئی صنف نہیں ان لوگوں نے مسدس کو ادبی دنیا میں ہمیشہ سے زیادہ وقیع و سر بلند کر دیا۔" [۱]

بیانیہ شاعری کے لئے صنف مثنوی نہایت موزوں تصور کی جاتی ہے لیکن مسدس میں وہی تسلسل پایا جاتا ہے جو مثنوی کے لئے ضروری ہے۔

انیس نے اپنے مرثیہ میں ناقدری عالم [۲] کی شکایت ضرور کی تھی لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ وہ ان خوش قسمت شعراء میں سے تھے جن کے کلام کی قرار واقعی قدر ان کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی اور ارباب ذوق نے ان کے اشعار سن کر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کئے اگر ابنائے زمانہ نے انیس کے کلام کی خاطر خواہ قدر نہ کی تو اس سے ان کی شاعری پر حرف نہیں آتا۔ اسی مفہوم کو چکبست کی زبانی سنیئے اور ان کی ہر دلعزیزی کی بابت مرزا جعفر علی خان اثر اور مہذب لکھنوی نے بھی اظہار خیال کیا ہے۔

"اگر آتش و انیس و غالب کی شاعرانہ وقعت کا صحیح اندازہ ہم سے نہ ہو سکا تو ان کی شاعری کا قصور نہ تھا بلکہ اپنی قومی بے خبری کے عالم میں جہاں ہم نے زندگی کے بہت سے معاملات میں مغربی تہذیب کے اکثر اصولوں کی غلط تعبیر کی وہاں انگریزی شاعری کے صحیح اندازے سے ہم نے اپنا مذاق سخن بھی الٹا سیدھا قائم کر لیا۔" [۳]

۱؎ اعجاز حسین، ڈاکٹر سید، "واقعہ کربلا اردو ادب اور دیگر فنون میں" بحوالہ رسالہ "محور" کراچی حسین نمبر، شمارہ ۱۲-۱۱، بابت ۶/ مئی، ۱۹۶۴ء ص ۳۲۔

۲؎ ناقدریٔ عالم کی شکایت نہیں مولا! کچھ دفتر باطل کی حقیقت نہیں مولا!

۳؎ چکبست، برج نرائن "مضامین چکبست" انڈین پریس الہ آباد ۱۹۲۸ء ص ۲۶۸

"مراثی انیس کے بیشتر مقامات تخیل اور محاکات کے لطیف امتزاج کے نادر مرقعے ہیں ان میں واقعات و جذبات مصور ہو گئے ہیں ان میں زندگی کی لہر ہے امنگ ہے دھڑکن ہے۔" ؎۱

اسی کتاب میں مرزا صاحب نے انیس کی ہستی پر فخر کیا وہ فرماتے ہیں "کیا بے جا ہے اگر ہم انیس کو زبان اردو کا محسن اور اس کو دنیا کی بڑی سے بڑی زبان کا ہم پلہ بنا دینے والا مانتے ہیں اور نازاں ہیں کہ ہم میں انیس سا شاعر پیدا ہوا۔" ؎۲

"ہم نے جہاں تک غور کیا ہم کو اردو شاعروں میں صرف انیس ہی کی ایک ایسی ذات ملتی ہے جس کو صحیح معنوں میں ہر دلعزیز ہونے کا شرف حاصل ہے بلکہ ہم تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ لفظ ہر دلعزیز اردو شاعروں میں انیس کے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ اپنے محیط و مکمل معنی میں کبھی استعمال ہی نہیں ہوا ہر اردو جاننے والے کی انیس کے مرثیے سے وہی دلچسپی ہے جو کسی زبان دان کو ہوتی عام اس سے کہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اور یہ بات انیس اور ان کے کلام کی ہر دلعزیزی نہیں تو اور کیا ہے۔" ؎۳

رباعیات میر انیس

انیس کی رباعیوں کے بارے میں ڈاکٹر سلام کے مقالے سے اقتباس

؎۱ اثر، مرزا جعفر علی خاں "انیس کی مرثیہ نگاری اور ان پر چند اعتراضات" ادبی پریس لکھنؤ، ناشر دانش محل لکھنؤ ۱۹۵۱ء، ص ۵۰

؎۲ اثر، مرزا جعفر علی خاں، محولہ بالا، ص ۱۰۲

؎۳ مہذب لکھنوی "وقار انیس" جلد اول، دیباچہ، ص ۷

پیش کیا جارہا ہے :

"کیف و کم دونوں اعتبار سے میر انیس اردو کے ایک ممتاز رباعی گو شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں ان کی رباعیات میں وہی سلاست و روانی ، جدت و ندرت فصاحت و بلاغت ، تازگی و شگفتگی ، نشست الفاظ اور بلندی تخیل موجود ہے جو میر انیس کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے " [۱]

اسی ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا کہ :

"میر انیس سے قبل اردو رباعی گو شعرا نے رثائی رباعیات بہت کم کہی ہیں میر انیس کے یہاں یہ رباعیاں ایک خاص موضوع کی حیثیت رکھتی ہیں ، میر انیس کا قلم مرثیہ نگاری میں جولانیاں دکھا چکا تھا اس لئے ان کو رثائی رباعیاں کہنے میں کوئی خاص کاوش نہیں کرنا پڑتی تھی ان کی رثائی رباعیوں میں تقریباً وہی مضامین ہوتے ہیں جو ان کے مرثیوں میں موجود ہیں" [۲]

رومال ہے اشکوں سے بھگونے کے لئے ۔۔۔ یہ راتیں یہ دن نہیں ہیں سونے کے لئے

ہنسنے کے لئے تو سال بھر ہے یارو ۔۔۔ دس روز محرم کے ہیں رونے کے لئے [۳]

"انیس اور دبیر نے مرثیہ گوئی میں جتنی کچھ شہرت حاصل کی اس کی مثال متقدمین اور متاخرین میں ملنا مشکل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک عرف عام میں انھیں مرثیہ گوئی کا امام سمجھا جاتا ہے ۔ یہ غلط ہے کیونکہ مرثیہ نگاری انیس اور دبیر سے بہت پہلے ارتقائی منزلیں طے کر چکی تھی فنی حیثیت کا تعین ہو چکا تھا مرثیوں کے اسلوب ایجاد

---

[۱] سلام سندیلوی ، ڈاکٹر ، "اردو رباعیات" ص ۳۶۳

[۲] " " " " ص ۷۰ - ۳۶۹

[۳] " " " " ص ۳۷۰

کردئے گئے تھے۔ انیس نے بھی اپنے متقدمین کی طرح متعدد غلطیاں کیں۔ ان کی سب سے نمایاں اور اہم غلطی کردار نگاری ہے ان کے تمام تر افراد مرثیہ عربی نژاد ہیں اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے ان کے رہن سہن اور طرز معاشرت میں مقامی تہذیبی رنگ بھرا ہے یہ کردار نگاری کا کمال نہیں بلکہ بہت بڑی بدعت ہے اسے میں اہل بیت کے مرتبے اور وقار کے منافی سمجھتا ہوں"۔ [۱]

یہ ملحوظ خاطر رہے کہ مرثیہ ہماری شاعری کی ایک اہم صنف ہے جس کی ایجاد کا سہرا اس برصغیر کے شعراء کے سر ہے۔ مرثیہ میں اردو کا رنگ اور اردو کا مزاج نمایاں ہے۔ مرثیوں کا پس منظر اور ماحول اور کردار عرب ہیں لیکن مرثیہ گو شعراء نے تصرف کرکے اردو کا پس منظر اور ماحول عطا کیا اور کرداروں کو ہمارے معاشرے کے کرداروں سے ہم آہنگ کر دیا تاکہ یگانگت کا عنصر اور تاثر پیدا ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بنیادی تصرف تھا لیکن اس پر اعتراض کرنا ذوق سلیم کو منہ چڑانا ہے۔

اسی ضمن میں ڈاکٹر زور اور مولانا اختر علی تلہری کے بیانات نقل کئے جاتے ہیں "میر انیس اگر کربلا کے درد انگیز واقعات کی ہو بہو نقل اتار دیتے تو ان کا کلام صرف ایک مذہبی یا تاریخی کتاب کی حیثیت میں منحصر رہتا اور وہ غیر محدود شہرت و عظمت جو آج ان کی شخصیت اور شاعری کی دامنگیر ہے ہرگز نصیب نہ ہوتی۔

---

[۱] عروج، عبدالرؤف، "اردو مرثیہ کے پانچ سو سال"، بار اول، مطبع انٹرنیشنل پریس کراچی، ناشر مکتبہ نیا راہی کراچی ص ۴۰

[۲] زور، سید غلام محی الدین قادری، تین شاعر یعنی (میر تقی میر، میر انیس اور ہیوگو اسمتھ) پر ایک تنقیدی نظر، شمس الاسلام پریس حیدر آباد دکن، ۱۹۲۶ء، ص ۷۶

یہی وجہ تھی کہ انھوں نے عربی طرز معاشرت کی جگہ ہندوستانی طرز معاشرت کے خاکہ میں اپنے عرب رجال داستان کو متحرک کیا اگر انیس اپنے مرثیوں میں عربی طرز معاشرت کی وفاداری کے ساتھ ترجمانی کرتے تو انھیں ہرگز کامیابی اور مقبولیت عام حاصل نہ ہوتی اور نہ صرف یہی بلکہ ادیب کامل اور اعلیٰ صناع ہونے سے بھی محروم رہ جاتے۔" ؎۱

"انیس شاعر ہیں اور حقیقی شاعر انھوں نے اردو شاعری کی تصویر میں رنگ بھرنے کے لئے عرب کی تاریخ کا ایک خونچکاں ورق سامنے رکھا ہے۔ وہ خون چکاں ورق جوان کے ایمان کا قیمتی سرمایہ بھی ہے یہ سچ ہے کہ ان کے شاعرانہ تخیلی تصرف نے عرب کی تاریخ اور عرب کے تمدن سے ہر جگہ پر بھیک نہیں مانگی ہے بلکہ بیشتر اپنے اردگرد کی چلتی پھرتی مناسب تصویروں سے مستقل انسانی نقشے حاصل کئے ہیں اس لئے ان کے مرقعوں میں عربی رنگ کے ساتھ ہندوستانی رنگ بھی موجود ہے۔" ؎۲

اعتراض کرنا بہت آسان ہے ذراسی جنبش قلم سے "طومار اغلاط" جمع ہوجاتا ہے لوگوں نے تو معاذ اللہ قرآن مجید پر بھی اعتراضات جڑ دیئے۔ انیس خدائے سخن ہی مگر کسی انسان کا کلام حرف آخر نہیں ہوسکتا مزید برآں کاتبوں اور نقل کرنے والوں کے قلم کی گلکاریاں۔ اگر انیس کے کلام میں کہیں کہیں کوئی ایسی لغزش نظر آتی ہے تو بشریت کا تقاضا بھی ہے اور کاتبوں کی مہربانیوں کا نتیجہ بھی۔

؎۱ زور، سید غلام محی الدین قادری، "تین شاعر یعنی (میر تقی میر، میر انیس اور ہوریس اکمتھ) پر ایک تنقیدی نظر" شمس الاسلام پریس حیدرآباد دکن، ۱۹۲۶ء، ص ۷۶

؎۲ اختر علی تلہری، مولانا، تبصرہ (انیس کی شاعری پر) بحوالہ شاہکار انیس" مرتبہ سید مسعود حسن رضوی۔ ص ۳

مولوی عبدالغفور نساخ نے انتخاب نقص میں دبیر اور انیس کے کلام پر خوب خوب اعتراضات فرمائے جن کے جوابات دیئے جا چکے ہیں تنقید کی ستم ظریفی کہ نساخ کو بھی انیس کا نقاد بنا کر ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

یہاں چند اعتراضات اور ان کے جوابات پیش کئے جاتے ہیں:

کہتے تھے نبیؐ امت بیدین نے مارا
ان باغیوں نے لوٹ لیا باغ ہمارا

مولوی صاحب کا اعتراض ہے کہ "امت بیدین میں اعلان نون جائز نہیں۔"[1]
قدیم اردو میں اعلان نون جائز سمجھا جاتا تھا اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں تاکہ غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے۔

"ناخدائے سخن نے یہاں تک کہہ دیا کہ" مستند ہے میرا فرمایا ہوا" انہی کا شعر ملاحظہ فرمائیے:

چشم بد دور کہ اب رنگ ہے کچھ گریہ پر
خون جھمکے ہے مرا دیدۂ گریان کے بیچ

(میر تقی میر، متوفی، ۱۸۱۰ء)

میر نظام الدین ممنون جن کا شمار استادوں میں ہوتا تھا اور جن کا انتقال ۱۸۴۴ء میں ہوا۔ یہ تقریباً انیس کے معاصر ہوتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

وہ تفتہ جگر ہوں کہ دمِ ذبح سے اب تک
ہے گرم مرے خنجرِ بُرّان کا لوہا[2]

مظہر علی خان ولا کا بھی شعر نقل کیا جاتا ہے ان کا تعلق دورِ متوسطین سے تھا

---

[1] نساخ، مولوی عبدالغفور، "انتخاب نقص" ص ۲۴
[2] قاسم علی خان، حکیم "مجموعہ نغز" ص ۲۱۳

آپ مصحفی کے شاگرد تھے:

کیا بلا ہے یہ مرے دیدۂ گریاں کے بیچ — ایک جیجون ہے کہ پلکوں سے بہا آتا ہے

'اترا یہ سخن کہہ کے وہ کونین کا عالی'

اعتراض یہ ہے کہ "کونین کا عالی غلط ہے"[۱] یہ طباعت کی غلطی ہے یا ہو سکتا ہے کسی کاتب کی اصلاح ہو۔ صحیح مصرع ہے:

اترا یہ سخن کہہ کے وہ کونین کا والی

انیس مرحوم "عالی" اور "والی" کے فرق کو نہ سمجھ سکے معاذ اللہ یہ "سوئے ظن" ہے۔

قاسم سے بھی لو ہم کو چھڑاتا ہے مقدر

رانڈ ہوتی ہے اک رات کی بیاہی ہوئی دختر[۲]

"اس شعر میں ہوتی کی 'ت'، تقطیع میں گر جاتی ہے یہ جائز نہیں"

انیس مرحوم سے زیادہ یہ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ ان کا کلام صحت کے ساتھ اب تک شائع نہ ہو سکا۔ صحیح مصرع ہے:

"بیوہ ہوئی اک رات کی بیاہی ہوئی دختر"

ان سوگ نشینوں سے یہ بولے شہ ذیشان — جن جن کے پسر ہو گئے تھے دشت میں بے جان

"سوگ نشین" کا لفظ فارسی زبان میں نہیں آیا اور اس کو ہندی بھی نہیں کہہ سکتے کہ ترکیب اس کی فارسی ہے اور دونوں لفظ بھی فارسی ہیں"[۳]

ترکیبوں کے بارے میں یہ عرض کرنا ہے کہ اہل زبان کو ترکیب سازی کا مکمل

---

[۱] نساخ، مولوی عبد الغفور، محولہ بالا ص ۲۵

[۲] " " " " " ص ۲۵

[۳] " " " " " ص ۲۶

حق حاصل ہے اگر ایسی ترکیبوں سے نثر نگار یا شاعر کے مفہوم کی وضاحت ہوتی ہے تو ان سے زبان میں قابل قدر اضافہ ہوگا بہت سے نثّار اور شعراء نے ترکیبیں وضع کیں جن کو قبول خاطر نصیب ہوا۔ اور وہ اردو ادب کا سرمایہ بن گئیں غالبؔ نے کتنی عمدہ ترکیبیں وضع کیں"۔ جدید ترکیبیں وضع کرنے کے نازک فن میں آج تک کوئی ان سے (یعنی انیسؔ سے) آگے نہ جا سکا [۱] آج کل کے شعراء میں حضرت جوشؔ نے نئی نئی ترکیبوں کی اختراع سے زبان کو کس قدر مالا مال کیا ہے۔

فلک نشین، تخت نشین، خاک نشین اور تہہ نشین کو قبول کر لیا اور "سوگ نشین" پر اعتراض جڑ دیا۔ آخر کیوں؟

بس اے انیسؔ بس کہ دعا کا ہے یہ مقام ہو مغفرت خلیق [۲] کی یا رب ذوالکرام

"اس لفظ میں "ذوالکرام" کے کچھ معنی نہیں مہمل ہے کیونکہ "کرام" جمع "کریم" کی ہے نہ کہ "کرم" کی"۔ [۳] انیسؔ مرحوم کو عربی اور فارسی زبانوں پر بھی عبور تھا اس قسم کی غلطیوں کو ان کی طرف منسوب کرنا اپنی بدذوقی کا ثبوت دینا ہے۔ صحیح مصرع اس طرح حسب ذیل ہے:

"ہو مغفرت خلیق کی یا خالق انام"

نالاں ہے تجھ سے روح رسول فلک اساس اتنا بھی دل نہ سخت کر اے ناخدا شناس

دوسرے شعر میں گردوں اساس آیا ہے۔

اعتراض ہے کہ "فلک اساس اور گردوں اساس کسی انسان کے وصف

---

[۱] سر تیج بہادر سپرو، "انیسؔ کی شاعری" بحوالہ شاہکار انیسؔ، محولہ بالا، ص ۳

[۲] خلیق، میر مستحسن، (متوفی ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء)

[۳] نساخ، محولہ بالا، ص ۲۷ رب ذوالاکرام بھی صحیح ہے فارسی میں اسی طرح برابر استعمال ہوا (ق-ح جعفری)

میں نہیں آتا"۔ ؎۱

رسول اکرم بشر ضرور تھے لیکن ایسے بشر جن پر وحی آیا کرتی تھی وہ خیر البشر بھی تھے اور افضل الانبیاء بھی۔ حضور ہی کی شان میں تو حدیث قدسی ہے "لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ" (اے رسولؐ اگر تم نہ پیدا ہوتے تو کائنات کا وجود بھی نہ ہوتا تمہاری وجہ سے تو زمین و آسمان پیدا کئے گئے) رسولؐ پاک کو دل سے ماننے والوں کے لئے تو وہ فلک اساس اور گردوں اساس سب ہی کچھ تھے اور "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کے مصداق۔ اس سلسلے میں یہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ انیسؔ کو قواعد کا پابند نہیں ہونا چاہیئے بلکہ قواعد ان کی مقرر کردہ شاہراہوں پر چلے اور ان کے طرز ادا کی روشنی میں قوانین فصاحت و بلاغت مرتب کئے جائیں۔ اگر تعصب کی عینک کو اتار کر انیسؔ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو بالاتفاق کہنا پڑے گا کہ جس طرح عروس سخن کو انھوں نے سنوارا وہ انہی کا حصہ تھا۔ پروفیسر قادری صاحب فرماتے ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ میر انیسؔ کا کلام اعجاز کی حد تک پہنچا ہوا ہے ہر مضمون انھوں نے اعلیٰ سے اعلیٰ لکھا ہے"۔ ؎۲

میر انیسؔ کی زبان کے بارے میں نقادوں کی آراء

میر صاحب مرحوم کی زبان کے بارے میں چند نقادوں کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

"میر انیسؔ کی شاعری میں ایک بڑا کمال یہ ہے کہ جس موقع پر جو الفاظ خاص اثر دے سکتے ہیں وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں اور بی بی اور کنیز اور آقا و خادم چھوٹے بڑے کے مخصوصات ادب کے لئے جو الفاظ مناسب ہیں وہی صرف کرتے ہیں۔

؎۱ نساخ، محولہ بالا ص ۲۸

؎۲ حامد حسن قادری، "مختصر تاریخ مرثیہ گوئی"، اردو اکیڈمی سندھ، ص ۱۰۲

میر انیسؔ ثقیل لفظوں اور تعقید کلام کو بالکل ناپسند کرتے ہیں اور ان کو کیسا ہی مضمون ہاتھ لگے لیکن جب تک وہ فصیح لفظوں کو ڈھونڈ نہیں لیتے اس مضمون کو داخل نظم کرنے پر متوجہ نہیں ہوتے میر انیسؔ کا کلام بلاغت کی جان سلاست کی روح اور فصاحت کی کان ہے۔" ؎۱

"اردو زبان ان کی خانہ زاد کنیز اور فصاحت بیان ایک ادنیٰ پرستار بلکہ پرستار زادی تھی۔ اللہ اللہ کیا سحر بیانی تھی کہ جس کے سامنے فصحاء و بلغاء سلف کی توصیف ایک پارینہ کہانی تھی مرثیہ گوئی کو ایسے معراج کمال پر پہنچا گئے کہ اسے ایک جداگانہ علم بنا دیا۔ رزم کے بیان سے رستم دلوں کو ہلا دیا۔ بزم کے ذکر سے شاہی درباروں کو شرما دیا، فطرت نے وہ بلا کی ذہانت و ذکاوت عطا کی تھی بات میں بات نکالتے تھے جس محاورے کو چاہا باندھ کر چار چاند لگا دیئے ایسے لوگ اب کہاں ہیں جو لطف زبان کے دلدادہ اور فریفتہ ہیں وہ آج تک انیسؔ کو روتے ہیں اور ہمیشہ روتے رہیں گے۔" ؎۲

"اور سچ پوچھئے تو انیسؔ و دبیرؔ کی شاعرانہ عظمت بیشتر انھیں خارجی مضامین کی وجہ سے قائم ہے واقعات کی یکسانیت کو دل چسپ بنانے کا دوسرا طریقہ تھا خوب صورت دل کش اور تازہ الفاظ کا استعمال اور الفاظ کے فن میں اردو شاعری ابھی تک انیسؔ کا جواب پیدا نہیں کر سکی۔" ؎۳

؎۱ اشہری، سید امجد علی، "حیات انیسؔ" مطبع آگرہ اخبار، ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء ص ۶۴

؎۲ سری رام، لالہ "خم خانۂ جاوید" جلد اول، مخزن پریس دہلی، ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء ص ۴۹۶، ۴۹۵

؎۳ فیضؔ، فیض احمد، "میزان" طبع اول، مطبوعہ نقوش پریس لاہور: فروری ۱۹۶۲ء، ص ۱۳۰ - ۱۲۹۔

"بیان کرنے کے لئے نئے اسلوب اردو شاعری نے بہ کثرت پیدا کر دیئے واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کر کے قوت متخیلہ کی جولانیوں کے لئے ایک نیا میدان صاف کر دیا اور زبان کا ایک معتد بہ حصہ جس کو اب تک شاعروں کے قلم نے مس تک نہیں کیا تھا اور جو محض اہل زبان کی بول چال میں محدود تھا اس کو شعراء سے روشناس کر دیا۔" ؎

اس طرح اردو زبان کو کوتاہ دامانی کا شکوہ نہ رہا۔ انیس نے اردو زبان کے ذخیرہ الفاظ میں جو اضافہ کیا اس پر اردو ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے ان کے کلام میں شرفا کا روزمرّہ ہے اور سلاست ہے لب ولہجے میں متانت ہے صنعتیں ایسی ہیں جن کو سامعین جلد سمجھ لیتے ہیں۔" ؎۱

میر انیس اور مرثیہ کا کمال:

مضمون کے آخر میں ایسے نقادوں کی آرا نقل کی جا رہی ہیں جن کے نقطہ نگاہ سے میر انیس نے مرثیہ کو کمال کی آخری منزل تک پہنچا دیا اور اب بظاہر ترقی کے امکانات نظر نہیں آتے۔

ایک مشہور محقق نے شاعر کی عظمت کے معیار کی بھی وضاحت فرما دی۔

"انیس اپنے کلام میں شروع سے آخر تک اپنی روایات خاندانی پر نظر رکھتے ہیں یہ بات عام طور پر مشہور رہی ہے کہ وہ "جگہ" کو "جاگہ" کہتے تھے اور اکثر آئیاں بجپائیاں بھی بول جاتے تھے اور مزید کہتے تھے کہ یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ حضرات لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے۔" ؎۲

؎۱ عبد الحئی، سید، "گل رعنا" (تذکرہ شعرائے اردو) مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء ص ۵۱۱۔

؎۲ ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر "لکھنؤ کا دبستان شاعری" طبع ثانی، اردو مرکز لاہور، ۱۹۶۷ء ص ۷۴۵

ڈاکٹر صاحب نے شاعر کی عظمت کا جو معیار مقرر فرمایا ہے وہ کس قدر صداقت پر مبنی ہے آپ فرماتے ہیں:

"انیس کا کلام ہر شخص کو متاثر کر سکتا ہے خواہ وہ عالم ہو یا عامی عقیدت مند ہو یا غیر عقیدت مند"۔[۱]

"مرثیہ گویوں میں مرزا دبیر اور میر انیس نے اس فن کو اس درجہ تک پہنچا دیا جس سے آگے ترقی کا راستہ بند ہو گیا اور سچ تو یہ ہے کہ نہ صرف مرثیہ گویوں بلکہ نکتہ سنج شعراء میں یہی دو بزرگوار ہیں جو آسمان بلاغت کے مہر و ماہ کہے جا سکتے ہیں ان کا ایک ایک مرثیہ بلاغت کا تاج سر اور ایک شعر بلکہ ایک ایک لفظ پیکر فصاحت کی جان ہے"[۲]

"اسی مرثیہ خوانی کی ضرورت و قدر نے میر انیس اور مرزا دبیر پیدا کئے جو کمال شاعری کے اعلیٰ ترین شہ نشین پر پہنچ گئے یا تو یہ مثل مشہور تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو یا لکھنؤ کے کمال مرثیہ گوئی نے سارے ہندوستان سے منوا لیا کہ عالم شعر و سخن میں مرثیہ گوئی کا مرتبہ دیگر اصناف سخن سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے"۔[۳]

میر انیس کا کلام ہموار ہے اور دوسرے شاعروں کی طرح رطب و یابس کا مجموعہ نہیں ہے اردو ادب میں میر انیس ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں بحیثیت شاعر کے ان کی جگہ صف اول میں ہے اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کو زبان اردو کے تمام شعراء سے بہتر اور کامل تر سمجھتے ہیں اور ان کو ہندوستان کا شکسپیئر اور خدائے سخن

---

[۱] ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۷۶۳

[۲] فوق، سید نظیر الحسن "المیزان" مطبع فیض عام علی گڑھ، ص ۲۔

[۳] شرر، مولوی عبد الحلیم "مضامین شرر" (ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گزشتہ لکھنؤ بار اول: مرکنٹائل پریس لاہور ص ۳۲۱۔

اور نظم اردو کا ہومر[1] ورجل[2] اور بالمیکی[3] خیال کرتے ہیں[4]

"مرثیہ نگاری کے آخری دور میں میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ نے مرقع نگاری اور معرکہ آرائی کے ہنگامے کو شامل کر کے اپنے زور بیان سے مرثیہ کو کمال پر پہنچا دیا۔"[5]

"واجد علی شاہ کے "سبعہ سیارہ" آج تاریخ ادب میں کوئی مقام نہیں رکھتے اس کے برعکس انیسؔ و دبیرؔ فلک نظم پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے حالانکہ وہ درباری شاعر تھے نہ خزانۂ شاہی سے مستقل تنخواہ پاتے تھے۔"[6]

"انیسؔ نے بھی تمام ادبی روایات کو نچوڑ کر ترقی کے تمام امکانات اپنے مرثیہ میں اس طرح سمو دیئے ہیں کہ اس میں تازگی، وسعت اور عظمت پیدا ہو گئی ہے اب اس کی تخلیقات کا جواب اس وقت تک کوئی پیدا نہیں کر سکتا جب تک اردو زبان کا مزاج نہ بدل جائے۔"[7]

نقادان انیسؔ نے ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ان کی شاعری کے محاسن بیان کئے اسی کے ساتھ مصوری، منظر نگاری، جذبات نگاری، واقعہ نگاری اور رزمیہ شاعری پر اظہار خیال فرمایا۔ انیسؔ کی زبان اور محاوروں پر تحسین و

---

[1] یونانی شاعر ہومر (HOMER) نے سب سے پہلے ایپک لکھی اس کی نظم (ILIAD) میں سولہ ہزار اشعار ہیں

[2] اطالوی شاعر ورجل (VIRGIL) — کی ایپک (AENIAD) دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے

[3] والمیک کی رامائن سنسکرت ایپک ہے اس میں اڑتالیس ہزار اشعار سے زائد ہیں۔

[4] رام بابو سکسینہ "تاریخ ادب اردو" (ترجمہ) مرزا محمد عسکری دوسری بار مطبوعہ نامی پریس لاہور۔ ناشر عشرت پبلشنگ ہاؤس ص ۳۲۴،

[5] سخاوت مرزا "قدیم دکنی شعرا کے چند نایاب مرثیے" در رسالہ سہ ماہی "اردو" کراچی: ۴ جون ۱۹۶۹ء شمارہ ۳۳، ص ۱۷

[6] ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر "دبستان دبیر" بار اول: نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ لکھنؤ مئی ۱۹۶۶ء ص ۱۳۰

[7] صفدر حسین، ڈاکٹر سید "اردو مرثیہ عہد بہ عہد" (ماہنامہ) "نگار" (پاکستان) کراچی ۱۹۶۷ء (سالنامہ اصناف شاعری نمبر) ص ۲۱۶

آفرین کے پھول نچھاور کیے ان کی نادر تشبیہات اور استعارات پر دل سے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ شاعری کی عظمت کے پرکھنے کا معیار بتا دیا۔ مرثیہ کے موضوع پر بحث کی اور انیس نے جو اس میں تنوع پیدا کیا اس کا بیان بھی کیا اور مرثیہ کی ترقی میں میر صاحب نے کیا کیا کارنامے انجام دیئے۔ ایسے بھی نقاد ہیں جنھوں نے انیس کی زبان ترکیبوں اور محاوروں پر اعتراضات کیے۔ بہر حال

"نظر اپنی اپنی قلم اپنا اپنا"

انیس مرحوم کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرثیہ اور انیس مترادف ہو گئے۔ مرثیہ کا لفظ سنتے ہی سننے والے کا ذہن فوراً خدائے سخن کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جب تک مہر کے پرتو میں چمک موجود ہے اس وقت تک اقلیم سخن میر صاحب کے قلم رو سے باہر نہیں جا سکتی۔ ان کے مراثی کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ:

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

شاگردانِ انیسؔ کا ایک جائزہ

"میر انیسؔ صاحب بڑے مرثیہ گو تھے لیکن انھوں نے یہ فن صرف اپنے بھائیوں اور بیٹے کو سکھایا سید محمد ہادی صاحب لائق اور سید محمد عباس صاحب ایم اے نے جو اس وقت میر انیسؔ صاحب کے ورثا ہیں راقم الحروف[۱] سے بہ اصرار و تاکید یہ ارشاد فرمایا کہ میر انیسؔ صاحب کا کوئی شاگرد نہیں تھا اور ان کے بھائیوں یا بیٹے کے علاوہ جو شخص مرحوم کی شاگردی کا دعویٰ کرے وہ غلط گو ہے"[۲]

ممکن ہے کہ مندرجہ بالا بیان کو صداقت پر محمول کیا جائے لیکن اگر تحقیق کا سہارا لیا جائے تو یہ بیان گمراہ کن ثابت ہوگا، اس میں کوئی شک نہیں کہ انیسؔ مرحوم کے شاگردوں کی فہرست بہت کم ہے اس ضمن میں یہ ملحوظ خاطر رہے کہ ان کے شاگردوں کی دو قسمیں تھیں، کچھ تو ان سے خوانندگی سیکھتے تھے، کچھ شاگرد ایسے بھی تھے جنھوں نے خوانندگی کے علاوہ مرثیہ گوئی میں بھی ان سے استفادہ کیا۔

"انیسؔ سے خوانندگی اور مرثیہ گوئی سیکھنے والوں میں میرے علم میں صرف چار شاگرد ایسے ہیں جن کے مطبوعہ مراثی اس وقت بھی ہمارے پاس موجود ہیں ان

---

[۱] ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی

[۲] " " " دبستانِ دبیر بار اول، مطبوعہ صفدر پریس لکھنؤ ناشر نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ مئی ۱۹۶۶ء ص ۱۶۶

چار میں تین خود خاندانِ انیسؔ کے افراد ہیں یعنی انسؔ (برادر انیس) مونسؔ (برادر انیس) اور نفیسؔ (فرزند انیس)، چوتھے شاگرد فارغؔ ہیں جو خاندانِ انیسؔ سے تو نہیں لیکن ہر اعتبار سے فخرِ خاندانِ انیسؔ ہیں۔[1] انسؔ اور مونسؔ دونوں میر مستحسن خلیقؔ کے شاگرد تھے[2] فارغؔ کے علاوہ اور بھی شعراء ہیں جن کا شمار انیسؔ کے تلامذہ میں کیا جاتا ہے، مثلاً آرزو حکیم سید بندہ رضا آرزوؔ خلف مولوی سید حسن رضا خاں بلگرامی وزیر شاہ اودھ ان کا سلسلہ حضرت زید شہید سے ملتا ہے ۱۲۷۶ھ ان کا سن ولادت ہے صرف و نحو منطق اور طب کی کتابیں لکھنؤ کے علماء سے پڑھیں۔

"جب طبیعت نے شعر و سخن کی طرف میلان کیا تو منشی محمد زکی صاحب زکیؔ بلگرامی اور شیخ امداد علی صاحب بحرؔ لکھنوی کو اپنے کلام کا مشیر بنایا...... مرثیہ گوئی میں میر انیسؔ کے شاگرد رہے اکثر مجالسِ عزا میں لکھنؤ سے باہر جانے کا بھی اتفاق ہوا"[3]

۱۔ امیرؔ شیخ امیر علی امیرؔ غازی پوری بھی انیسؔ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے[4]

۲۔ حزیںؔ، حکیم محمد علی حزیںؔ کو بھی انیسؔ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا قمر الدین ناظمؔ کے ضمن میں ان کا تذکرہ کیا گیا ہے

"متعدد علماء سے انھوں نے (ناظمؔ نے) علم حاصل کیا فن شعر میں حکیم محمد علی حزیںؔ جو میر انیسؔ مرثیہ گو مرحوم لکھنوی کے شاگرد ہیں ان سے مشورہ رکھتے ہیں[5]"

---

[1] ڈاکٹر صفدر آہؔ "انیسؔ کے ایک مایۂ ناز شاگرد فارغؔ"، افکار شمارہ ۱۹۔ رابسن روڈ کراچی ص ۱۸

[2] محسن علی محسنؔ "تذکرہ سراپا سخن" (مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن)، ص ۲۳ و ص ۹۷

[3] لالہ سری رام، "خمخانۂ جاوید جلد اول" بار اول مطبع نول کشور لاہور ۱۹۰۸ء ص ۲۱/۲۲

[4] غنچۂ ارم ۱۲۹۹ھ

[5] ضیغم محمد عبداللہ "یادگار ضیغم" ۱۳۰۲ھ ص ۳۳۸

٣۔ خسرو۔ نواب حسن علی خاں خسرو کا شمار بھی انیس کے شاگردوں میں ہوتا ہے[1]

۴۔ ذکی، اسد اللہ مرزا محمد ذکی خاں بہادر، خلف مرزا محمد علی خاں بہادر عرف مرزا حیدر "نواب موصوف پہلے شاگرد میر ببر علی انیس کے تھے بعد اس کے سرفراز علی قادر کے ہوئے"[2]

۵۔ رشید پیارے صاحب رشید کا نام سید مصطفےٰ مرزا تھا ان کے والد کا اسم گرامی احمد میرزا صابر تھا ۲۹ صفر ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء وہ پیدا ہوئے خاندان کے بزرگ ان کو پیارے پیارے کہتے تھے اس لئے یہ عرف ہو گیا۔

ابتدا میں پیارے صاحب رشید نے غزلیں کہیں اور شہرت حاصل کی بعد ازاں مرثیے لکھے ان کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ

"وہ اپنا کلام اپنے چچا میر عشق کو دکھاتے تھے اور کبھی کبھی میر انیس سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ رشید کی توجہ زیادہ تر زبان پر تھی اور اس میں وہ اپنے استاد انیس کے قدم بہ قدم چلتے تھے۔ مرثیے غزلیں سلام و رباعیاں بکثرت لکھیں کبھی کبھی قصیدے بھی کہے ہیں"[3]

۶۔ رفیق۔ "مرزا علی حسین رفیق ابن میرزا علی نقی... مرد ذہین و ذکی مرثیہ و سلام میں میر ببر علی انیس سے مشورہ ہے مرثیہ خوانی کا رنگ اونھیں سے سیکھا ہے اور اقسام شعر میں ابتدا مولوی محمد بخش شہید شاگرد شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے اب شیخ امداد علی بحر سے تلمذ ہے"[4]

---

[1] ارمغان فرح دسمبر ۱۸۹۸ء

[2] ناصر سعادت خاں "تذکرہ خوش معرکۂ زیبا" طبع اول مطبع ظفر سنز پرنٹرز لاہور (مرتبہ مشفق خواجہ) ناشر مجلس ترقی ادب لاہور اپریل ۱۹۷۰ء ص ۳۳۸

[3] رام بابو سکسینہ "تاریخ ادب اردو" مطبوعہ نامی پریس لاہور (ترجمہ مرزا محمد عسکری) ناشر عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور ص ۳۴۰

[4] منشی امیر احمد۔ انتخاب یادگار، تاج المطابع ۴ ذی الحجہ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء ص ۱۵۸

۷۔ رئیس۔ میر عسکری رئیس خلف و شاگرد میر ببر علی انیس (متوفی ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء)
۸۔ زکی۔ مرزا محمد زکی علی خاں لکھنوی "شاگرد مولوی محمد محسن شہید و حضرت انیس" ۱؎
۹۔ سراج۔ "سراج الدین احمد سراج ولد سید نجیب الدین بھوپال میں تھانہ دار تھے اور تحصیلدار رہے شعر گوئی میں میر ببر علی انیس کے شاگرد تھے، سراج العارفین سراج المومنین اور زاد غریباں کے مصنف ہیں" ۲؎
۱۰۔ شیدا۔ حکیم میر محمد رسول خاں بہادر شیدا خلف میر ہاشم علی خاں موہانی ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۵۲ء) میں پیدا ہوئے مولوی غلام حسنین صاحب کنتوری اور مولوی نعمت اللہ صاحب فرنگی محلی سے انھوں نے استفادہ کیا فن طب کے علاوہ علم ریاضی میں ان کو کافی مہارت تھی۔

"فن شعر گوئی میں انیس مرحوم سے اصلاح لی ۔۔۔۔ مرثیہ، قصیدہ، غزل کے علاوہ فن تاریخ گوئی سے خاص مناسبت تھی" ۳؎

۱۱ ضیا۔ سید باقر حسن متخلص بہ ضیا
مثنوی ضیائے دکن کے منظوم دیباچے سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن سے شاعر کے حالات اور واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ دیباچہ تحفہ کے قابل نہیں | بہر حال ہے ہدیۂ ناظرین
ترصد ہے دل سے کریں سب خیال | بتاتا ہوں میں مختصر اپنا حال
میں ہوں اک نمک خوار شاہِ دکن | تخلص ضیا، نام باقر حسن

۱؎ لالہ سری رام "خمخانۂ جاوید" جلد سوم، بار اول، دلی پرنٹنگ ورکس دلی ۱۹۱۷ء، ص ۲۲۴
۲؎ برتر سید رحیم بخش "تاریخ واسطی" مطبع ریاضی امروہہ ص ۳۲۱
۳؎ لالہ سری رام "خمخانۂ جاوید" جلد پنجم، بار اول، ناشر لالہ امیر چند کھنہ علی پور روڈ دہلی، (مرتبہ پنڈت برجموہن دتاتریہ) ۱۹۴۰ء ص ۱۳۶-۱۳۵

جواں جب میں تھا دل مرا زندہ تھا — میں گویا چراغِ فروزندہ تھا
مجھے صحبتِ نیک کا عشق تھا — اسی فصل میں شوق تھا نظم کا
تھے استاد میرے انیس و اسیر[1] — کہ تھا مثل جن کا نہ کوئی نظیر
میں اک تربیت یافتہ ان کا ہوں — عنایت جو تھی مجھ پہ وہ کیا کہوں
انھیں سے کوئی دس برس تک رہا — تلمذ کا اور شغل اصلاح کا
یہ سب اس زمانے کی ہے گفتگو — کہ تھا لکھنؤ جب کبھی لکھنؤ[2]

۱۸۵۶ء میں شاہی بساط الٹ گئی واجد علی شاہ مٹیا برج بھیج دیئے گئے۔ لکھنؤ تباہ و برباد ہوگیا۔

۱۲۔ عابدؔ۔ میر عابد علی عابدؔ کمیدان پلٹن خلف میر مہدی علی لکھنوی "شیخ امان علی سحرؔ ان کو کہتے ہیں کہ میرے شاگرد ہیں اور میر انیس مرثیہ گو فرماتے ہیں کہ مجھ سے اصلاح لی ہے"[3] بالفاظ دیگر میر عابد علی کو دونوں کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔

۱۳۔ عروجؔ۔ نواب مرزا محمد باقر علی خان بہادر عروجؔ خلف اشرف الدولہ نواب حاجی مرزا احمد علی خاں لکھنوی (م ۱۹۲۱ء) شاگرد میر ببر علی انیس و سید عباس حسن فصاحتؔ۔

۱۴۔ عکسؔ۔ مرزا محمد عباس عکسؔ لکھنوی شاگرد میر ببر علی انیس و مرزا علی بہارؔ لکھنوی۔

۱۵۔ غیورؔ۔ سید محمد نواب غیورؔ خلف میر محمد سلیسؔ شاگرد میر انیس۔

۱۶۔ فارغؔ۔ میر محمد افضل فارغؔ سیتاپوری خلف حکیم سید طاہر علی ۲۷ جنوری ۱۸۴۳ء

---

[1] اسیرؔ۔ منشی مظفر علی اسیرؔ

[2] ضیاؔ، سید باقر حسن، معتمد مجلس عالیہ عدالت، مثنوی ضیائے دکن مع حصہ دوم طبع ثانی مطبع برہانیہ بلدۂ حیدر آباد دکن ۱۳۰۸ھ ص ۲ و ۳

[3] محسن، سید محسن علی "سراپا سخن" (مرتبہ ڈاکٹر سید اقتدا حسن) مطبع عالیہ تمپل روڈ لاہور، ناشر اظہار سنز تمپل روڈ لاہور جنوری ۱۹۷۰ء ص ۶۹

کو وہ سیتاپور میں پیدا ہوئے، فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھنے کے بعد غزل گوئی کی طرف مائل ہوئے افضل تخلص کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے اپنے والد ماجد سے کہا کہ "اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں غزل گوئی ترک کر دوں تو مجھے میر انیس کا شاگرد کرا دیجئے"[۱]

۱۲۸۱ھ[۲] میں جب سید محمد افضل کو انیس کی شاگردی کا فخر نصیب ہوا تو انھوں نے فارغ تخلص اختیار کیا۔ میر صاحب کے ارشاد کے مطابق فارغ نے مرثیہ گوئی بھی شروع کر دی پہلے مرثیہ کا پہلا بند ملاحظہ ہو:

میں بلبلِ حدیقہ بزمِ انیس ہوں　　پروانۂ سراج کلام نفیس ہوں
خلاقِ صد نکاتِ دقیق و سلیس ہوں　　اقلیم تاجدارِ سخن کا رئیس ہوں
حاسد مقر ہوا سخنِ لاجواب کا
آندھی بجھا سکی نہ چراغ آفتاب کا[۳]

میر صاحب نے پہلے مرثیے کی اصلاح فرمائی آخری بند میں فارغ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے:

مضموں بہت نفیس ہیں بندش سلیس ہے
حقا کہ سب یہ فیض کلام انیس ہے[۴]

فردوس۔ میر ولایت علی فردوس رائے بریلوی، ان کو بھی میر صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل تھا ۱۹۱۰ء میں ان کا انتقال ہوا[۵]۔

۱؎ نہال حسین حکیم، "حال فارغ"، مطبوعہ مرقع عالم پریس ہردوئی ۱۹۰۲ء ص ۲۰
۲؎ فارغ سے تاریخ نکلتی ہے ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء
۳؎ فارغ سیتاپوری سید محمد افضل، "پہلا مرثیہ" مطبوعہ امیر المطابع سیتاپور ۱۹۱۵ء ص ۲
۴؎ " " حوالۂ بالا ص ۹۸
۵؎ زمانہ کانپور۔

۱۷۔ مانوسؔ۔ نواب خواجہ حسین خاں مانوس لکھنوی۔ شاگرد میر انیس

۱۸۔ مرتجؔ۔ سید حسن علی مرتج خلف میر نثار علی لکھنوی۔ یہ میر انیس اور میر نفیس دونوں کے شاگرد تھے۔ ۱۸۹۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔

۱۹۔ معززؔ سید محمد علی معزز مکن پور کے رہنے والے تھے ریاست پٹیالہ میں ملازم تھے "شاگرد انیس مرثیہ گو" [۱]

۲۰۔ نفیسؔ میر خورشید علی نفیس خلف اکبر و شاگرد میر ببر علی انیس [۲]

۲۱۔ وقارؔ۔ سید فضل علی رئیس اعظم ضلع بارہ بنکی حضرت انیس کے شاگرد تھے [۳]

۲۲۔ یونسؔ۔ میر کاظم حسین۔ ہمشیر زادہ و شاگرد میر ببر علی انیس [۴]

میر انیس مرحوم کے شاگردوں کی ایک فہرست پیش کی گئی ہے جس میں ان کے خاندان کے افراد بھی شامل ہیں اور وہ حضرات بھی جن کا ان کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں ممکن ہے کہ مزید تحقیق سے اس فہرست میں اضافہ ہو سکے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ انیس کے خاندان کے علاوہ کسی کو ان کی شاگردی کا فخر نصیب نہ ہو سکا یہ سوئے ظن ہے۔

---

[۱] نساخ مولوی عبد الغفور "تذکرہ سخن شعرا" مطبع منشی نول کشور لکھنؤ رمضان شریف ۱۲۹۱ھ مطابق اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۴۵۰

[۲] "مرثیہ اور میر انیس" کے عنوان سے راقم الحروف کا مضمون اردو نامہ کراچی شمارہ ۴۱ (جنوری ۱۹۷۲ء) میں شائع ہو چکا ہے

[۳] وقار، سید فضل علی، خورشید خاوری، بار اول، نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۳۶ء دیباچہ ص ۲

[۴] گلدستۂ سلام ۱۳۴۴ھ۔

مرثیہ اور میر نفیس

مرثیہ :-

" دستور قدیم ہے کہ کسی عزیز و قریب یا دوست خواہ امیر و رئیس کی وفات کا واقعہ اور حزن و ملال کا حال مرثیے میں لکھتے ہیں اور یہ وضع صرف اہل فارس کی نہیں ہے۔ بلکہ عرب میں بھی یہ دستور قدیم سے جاری ہے اور اب اکثر مرثیہ وہی ہے جس میں حضرت امام حسینؑ اور ان کے رفقار کی شہادت کا حال اور واقعہ کربلا لکھا جاتا ہے اور مسدس یا مثمن ترجیع بند خواہ ترکیب بند کی شکل میں ہوتا ہے"۔[1]

مرثیہ گوئی کے لئے چند اصول وضع کئے گئے ہیں تاکہ مرثیہ کی تکنیک پر روشنی پڑ سکے ان میں "مرثیہ" گوئی کے بڑے اصول تین ہیں :

۱ - ممدوح کی عظمت و شان کا ذکر کیا جائے تاکہ اس سے عبرت کا سبق حاصل ہو کہ اس پایہ کا شخص اٹھ گیا۔

۲ - اس کے مرنے سے ملک میں جو رنج و ماتم برپا ہے اس کا ذکر کیا جائے۔

۳ - اس کو مخاطب کر کے ایسے خیالات ظاہر کئے جائیں جن سے یہ بات ثابت ہو کہ انتہائے وارفتگی اور مدہوشی کی وجہ سے مرثیہ کہنے والے کو اس کے مرنے کی بھی خبر نہیں، اور وہ اب تک اس کو اسی طرح مخاطب کر کے باتیں کرتا ہے جس طرح زندگی میں کرتا تھا"۔[2]

۱؎ نجمی، مولوی محمد نجم الغنی، "بحر الفصاحت"، لکھنؤ : مطبع نول کشور۔ ۱۹۲۶ء ص ۱۳۰

۲؎ شبلی نعمانی۔ مولانا، " شعر العجم" جلد اول، لاہور : ناشر ملک نذیر احمد، اردو بازار، ۶۴ ۔

۸۱

مرثیہ کا آغاز:۔

اس کے بارے میں ایک مشہور نقاد کا نظریہ ہے کہ "گیارہویں صدی ہجری کے آخری دو چار سالوں (یعنی ۱۶۸۵ء سے ۱۶۸۷ء تک) میں دکن ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہوا جس نے اس سرزمین کی تہذیب و شائستگی اور علم و فضل کی بنیادیں ہلا دیں۔۔۔ سکندر عادل شاہ اور ابوالحسن تاناشاہ کی شکست اور قید کے بعد ان شہروں کی وہ مرکزیت ختم ہوگئی جو علم و فضل اور شعر و سخن کا گہوارہ ثابت ہوئی تھی۔۔۔ اور چوں کہ فاتح دکن شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی اور ان کے کارندوں کی سیاست کے ڈر سے وہ اپنے جذبات و خیالات کو صاف صاف ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے مرثیہ گوئی کو اپنا شعار بنا لیا اور اپنے غم زدہ دلوں کی بھڑاس حضرت امام حسینؑ اور شہدائے کربلا کے مرثیے لکھ لکھ کر نکالی[۵]"

مندرجہ بالا بیان سے اختلاف کی کافی گنجائش ہے کیوں کہ دکن میں اردو شاعری کا آغاز ہی مرثیہ کا پیش خیمہ بھی تھا۔ دکنی ادب کی تاریخوں کی ورق گردانی سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں اس کو بہت ترقی ہوئی فرمانروایان سلطنت کی سرپرستی میں بھی مرثیہ کو بہت عروج ہوا یہی وجہ ہے کہ دکنی مرثیہ کو ہمارے ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں پانچ مرثیے ملتے ہیں اور ان کے علاوہ عبداللہ قطب شاہ، وجہی، غواصی، اشرف، احمد، کاظم، مرزا بیجاپوری، نوری، ہاشمی، فضل ہاشم علی، برہان پوری، قادر، خان دوران، درگاہ قلی، لطیف وغیرہ نے گولکنڈہ اور

۵۔ زور، ڈاکٹر محی الدین قادری، "دکنی ادب کی تاریخ"، کراچی: ایجوکیشنل پریس۔ ناشر اردو اکیڈمی سندھ، جون، ۱۹۶۰ء ص ۲ ۔ ۱۰۰۔

بیجاپور کے ، زوال (۸۷ - ۱۶۸۶ء) سے قبل مرثیے لکھے اور یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ دکنی شعرا کے بہت کم مرثیے شائع ہوئے زیادہ تر مرثیے بیاضوں میں ملتے ہیں۔

دکنی زبان کے جو مراثی مطبوعہ ہیں یا مختلف بیاضوں میں محفوظ ہیں ان کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ابتدا میں مرثیہ کا مفہوم رونا رُلانا تھا۔ اصل ترقی اس صنف نے شمالی ہند میں کی۔ ہیئت کے لحاظ سے بھی اور موضوع کے نقطۂ نظر سے بھی۔

شروع میں مرثیہ دو مصراعی ہوتے تھے اور ان میں غزل کی طرح ردیف و قافیہ کی پابندی ہوتی تھی بعد میں چو مصراعی اور پنج مصراعی ہونے لگے۔ شمالی ہند میں سودا حیدری اور مسکین کے زمانے سے مسدس کا رواج ہوا۔ مرثیہ کی ہیئت میں تبدیلی تو ضرور ہوگئی لیکن موضوع امام حسین علیہ السلام اور اہلبیت کے غم و درد کا اظہار تھا۔

مرثیہ کا موضوع :-

مرثیہ میں امام حسین علیہ السلام کی مدینہ سے روانگی رفقاء اور اعزہ سمیت کربلا میں ۲ محرم ۶۱ ہجری کو ورود نہر فرات کے قریب سے خیام کا ہٹایا جانا۔ ہفتم سے اہلبیت پر پانی کا بند کیا جانا، شب عاشورہ، لڑائی کی تیاریاں بعد ازاں امام حسین علیہ السلام کے کہنے سے ایک شب کی مہلت ملی، یوم عاشورہ ہنگامہ کارزار کی ابتداء ہوئی۔ ابن سعد نے پہلا تیر امام حسین علیہ السلام کے لشکر کی طرف پھینکا۔ بعد ازاں امام کے لشکر پر تیروں کی بوچھار ہونے لگی، یکے بعد دیگرے امام حسین علیہ السلام کے رفقاء اور اعزہ شہادت کے درجے پر فائز ہوگئے۔ ہنگام عصر امامؑ کی شہادت واقع ہوئی اس واقعہ کی تاب زمین اور آسمان بھی نہ لا سکے۔ زمین متزلزل ہوئی، سیاہ آندھیاں چلنے لگیں اور آسمان سے خون برسنے لگا۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز کے ساتھ ہی مرثیہ گوئی کی ابتدا بھی ہوئی محمد شاہی دور میں شاہ حاتم اور میر محمدی بیدار نے جو مرثیے لکھے ان کے بعد مسکین، سودا اور میر نے مرثیے لکھے۔ اسی زمانے سے مرثیہ نے مسدس کی ہیئت اختیار کرلی۔

میر ضمیر، میر خلیق، میاں دل گیر اور مرزا فصیح مرثیہ کی تعمیر اور ترقی کے سلسلے میں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ میر ضمیر وہ شخص ہیں جو بعض حضرات کی نظر میں موجودہ طرز مرثیہ نگاری کے موجد ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ خیال صحیح ہو کیونکہ ان کے حسب ذیل بند سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

جس سال لکھے تھے وصف یہ ہم شکل نبیؐ کے — تھے بارہ سو اڑتالیس وہ سالِ نبوی کے[1]

آگے کبھی دیکھے نہ تھے یہ طرز کسی کے — اب سب ہی مقلد ہوئے اس طرز نوی کے

دس میں کہوں سو میں کہوں یہ درد ہے میرا

جو جو کہے اس طرز میں شاگرد ہے میرا

ان حضرات نے مرثیہ کے موضوع کو تنوع بخشا اور رزمیہ اشعار لکھے معرکۂ کارزار کی مرقع کشی کی اس طرح اردو زبان بہت سی اصطلاحاتِ جنگ سے روشناس ہو گئی۔ منظر نگاری اور جذبات نگاری کے نمونے بھی۔ ان حضرات کے مرثیوں میں ملتے ہیں۔

انیسؔ اور دبیرؔ نے فنِ مرثیہ گوئی میں کمال حاصل کیا اور زبان کو وسعت بخشی۔

خداوند تعالٰے نے میر انیس کو تین فرزند عطا کئے تھے۔ میر خورشید علی نفیس میر عسکری رئیسؔ اور سیّد محمد سلیسؔ۔

"سن کے علاوہ فن کے اعتبار سے بھی میر نفیسؔ اپنے تمام بھائیوں میں ممتاز تھے۔ استعداد علمی بہت اچھی تھی۔ فارسی میں میر محمد عباس سے مشورہ تھا اور اردو میں اپنے والد کے شاگرد تھے۔ مرثیہ گوئی کی شہرت میں میر انیسؔ کے بعد انھیں کا مرتبہ ہے۔

نفیسؔ کا معمول تھا کہ ۲۵ رجب کو اپنا نو تصنیف مرثیہ دلارام کی بارہ دری میں پڑھا کرتے تھے ......

ایک مرتبہ میر صاحب مرثیہ جدید پڑھ رہے ہیں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں

---

[1] مطابق ۱۸۳۴ء

صاحب مجلس ممبر کے پاس کھڑے ہیں۔ یہ بھی ایک مُسن آدمی ہیں میر انیس کے ملنے والے میر اعظم علی نام ہے رجب کی مجلس ان کی مشہور ہے لوگ دور دور سے آتے ہیں آٹھ آٹھ روز تک اسی انتظار میں قیام فرماتے ہیں۔

میر صاحب اسی انداز سے پڑھ رہے ہیں محویت کا عالم ہے ایک مرتبہ آپ نے ہاتھ اُٹھا کر کہا:-

وہ گرد اٹھی وہ جگر بند بوتراب آیا

ممبر پر نیم قد کھڑے ہو گئے اور ہاتھ سے اشارہ کر کے "وہ" اس طرح کہا کہ لوگ پیچھے پھر کے دیکھنے لگے۔"[1]

کسی نے تعریف کی کہ "آپ کے کلام میں بالکل میر انیس مرحوم کا رنگ ہے۔ آپ بگڑ بیٹھے اور کہنے لگے "یہ آپ نے کیا کہا۔ وہ کجا اور میں کجا۔ ہاں ان کا ایک ادنیٰ خوشہ چیں ہوں آپ نے ان کے مرتبے کو پہنچا نا نہیں۔"[2]

نفیس نے تقریباً ساٹھ (۶۰) (پینسٹھ (۶۵)) سال مشق سخن کی اور مرثیہ گوئی میں انھوں نے بہت شہرت حاصل کی۔ صحیح معنی میں وہ اپنے والد کے جانشیں تھے اور وہ فخر خاندان ہی نہیں بلکہ فخر ہندوستان بھی تھے۔ ان سے (میر نفیس سے) میر انیس بلکہ پورے خاندان کا نام روشن ہوا۔ بہت خوش گو اور قابل تھے اور اپنے بعد ایک بڑا ذخیرہ مراثی[3] ...

---

[1] (مولفہ) عشرت، خواجہ عبدالرؤف لکھنوی (مرتبہ جعفر علی نشتر) تذکرہ آب بقا، بار اول نامی پریس لکھنؤ، ستمبر ۱۹۲۸ء ص ۲۲ - ۱۳۱

[2] ایضاً ص ۱۲۵

[3] عارف صاحب مرحوم کے صاحبزادے سید یوسف حسن صاحب نے راقم الحروف کو بتایا کہ "میر نفیس مرحوم کے مراثی پانچ جلدوں میں ہندوستان میں شائع ہو چکے ہیں اب بھی بہت سے مرثیے غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کے بڑے بھائی سید ہادی حسن صاحب لائق کے پاس بہت سے مرثیے لکھنؤ میں موجود ہیں۔

وسلام و رباعیات وغیرہ کا چھوڑ گئے ہیں۔[۵۱]

میر نفیس کا انتقال ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں ہوا سید محمد ہاشم صاحب[۵۲] نے حسب ذیل تاریخ وفات لکھی۔ جس سے ان کے محاسن کلام پر بھی روشنی پڑتی ہے :

بلبلِ باغ ثنا و چمن آرائے سخن — والاان کا تھا سخن اور وہ شیدائے سخن
وارثِ فن و کمال اب و اجداد نفیس — عارف کنہ سخن واقف منشائے سخن
ان کی نیسانِ طبیعت سے گئی عالم میں — بحر مواج سخن کو دُرِ یکتائے سخن
عہدۂ مدح ائمہ میں ہوئی پانچویں پشت — پائے نام ان کی رہا منصب والائے سخن
ضاحک و میر حسن میر خلیق اور میر انیس — تھے یہ سب زیب وہ مسند زیبائے سخن
لاجواب ان کے سخن اور یہ سخن سے بے مثل — تھا نظیر ان کے سخن اور یہ ہمتائے سخن
یہی باب اور یہی مرجع سخنِ زیبا کے — رکھتا تھا ان سے سخن آپ تمنائے سخن
شاعر اس طرح کا گویا نہ ہوا اُردو میں — ہر سخندان کو نہیں اس میں کہیں جائے سخن
تھے وہ یوسفِ کنعانِ معانی حسین — سوگ میں مرگ سے جن کی تھی زلیخائے سخن
وہ فصاحت وہ بلاغت وہ کلامِ شیریں — جس کے مذکور پہ لب چاٹ کے رہ جائے سخن
جوہری لوٹتے تھے لعل و گہر مضمون کے — موجزن ہوتا تھا جب آپ کا دریائے سخن

سال رحلت کی ہوئی فکر تو ہاتف نے کہا
دارِ عالم سے گیا مُحیِ و مولائے سخن

۱۳۱۸ھ

اس مضمون میں مرثیے کے اجزائے ترکیبی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نفیس کے مراثی پر تبصرہ کیا جارہا ہے۔ مرثیے کے اجزائے ترکیبی بالعموم حسب ذیل مانے جاتے ہیں :۔

---

۵۱ مرزا محمد عسکری (مترجم) "تاریخ ادب اردو" از رام بابو سکسینہ، لکھنؤ۔ مطبع نولکشور دوسری بار ص ۲۸۴

۵۲ ہاشم، سید محمد (ڈپٹی کلکٹر) مجموعہ تاریخ معروف بہ تاریخ "آئینہ جمال" ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء ص ۲۸-۲۷

"(۱) چہرہ، (۲) سراپا، (۳) رخصت، (۴) آمد (۵) رجز (۶) جنگ۔ (۷) شہادت اور (۸) بین"

لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر مرثیہ میں تمام اجزائے ترکیبی پائے جائیں مثلاً جو مراثی شہادت امام حسین علیہ السلام کے بعد کے حالات پر لکھے گئے۔ ان میں قید کے مظالم اہلبیت کا دربار یزید میں ورود، بی بی سکینہ کا شام کے زندان میں انتقال، قید سے رہائی کے بعد اہل بیت اطہار کا کربلائے معلیٰ میں داخلہ اور لاشہ ہائے شہدا کا دفن کرنا بعد ازاں مدینہ منورہ واپسی مرثیوں کے موضوعات میں شامل ہیں۔

ا۔ چہرہ:۔

چہرہ یعنی مرثیہ کا آغاز۔ شاعر بعض اوقات تعلی سے کام لیتا ہے۔ یا جس کے حال کا مرثیہ ہو اس کی مدح کی جاتی ہے یا کسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ کبھی مناظر قدرت کا بیان ہوتا ہے اور کبھی دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ میر نفیس نے بھی اول اول اسی روش کو قائم رکھا۔ چنانچہ ان کے ایک مرثیے[ا] کا چہرہ پیش خدمت ہے جس میں شاعر نے تفاخر سے کام لیا ہے اور بجا طور پر:۔

پھر بادشاہِ ملکِ سخن حکمراں ہے آج
پھر جلوۂ جلوسِ معانی عیاں ہے آج
پھر مثلِ بحر، جوش پہ طبع رواں ہے آج
پھر درفشاں، زبانِ بلاغت نشاں ہے آج
مشتاق، نقدِ نظم ہر اک حق پسند تھا
لو آج پھر کھلا وہ خزانہ جو بند تھا

ہے بحرِ نور حال یہ فکر و نظر کا ہے
یہ طبع باصفا ہے کہ معدن گہر کا ہے
یہ ذہن پُرضیا ہے کہ مسکن قمر کا ہے
مطلع ہے مرثیے کا کہ مطلع سحر کا ہے

ا۔ مطلع "پھر بادشاہ ملک سخن حکمران ہے آج"، تعداد بند ۱۵۴

مدحت ہے اس میں لخت دلِ بوتراب کی
مجلس میں روشنی ہے اسی آفتاب کی[1]

پُرشکوہ الفاظ اور حسن ترتیب سے سامعین پر ایک خاص قسم کا اثر ہوگا اور ذوقِ سلیم تحسین و آفریں کے پھول نچھاور کرے گا۔

ایک دوسرا مرثیہ ہے جس کا موضوع حضرت عباسؑ ہیں اس مرثیہ کا چہرہ اس طرح نظم کیا گیا ہے:

عباسؑ کو جہاد کی جس دم رضا ملی
پایا شرف سعادتِ قربِ خدا ملی
جان آگئی کہ دردِ جگر کی دوا ملی
رخصت ملی کہ دولتِ لا انتہا ملی
دے کر دعائیں شہ کے قدم چومنے لگے
اٹھ کر قدم سے مثلِ اسد جھومنے لگے[2]

اس کی خوشی جو تھی کہ ملی اب رہِ ثواب
چہرہ کا رنگ سرخ ہوا مثلِ آفتاب
تیغ و سپر اٹھا کے جری نے بہ آب و تاب
پٹکا کمر سے باندھ لیا مثلِ بوتراب
جوش آگیا۔ فزوں۔ ہوسِ جنگ ہوگئی
بالیدگی سے تن پہ زرہ تنگ ہوگئی[3]

اس چہرے میں نفیس نے ایک ماہر نفسیات کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ امام حسینؑ نے جب حضرت عباسؑ کو نہر فرات سے پانی لانے کی اجازت دے دی تو آپ کی دلی مراد حاصل ہوئی۔ آپ خوش ہوئے۔ اسی لئے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ حضرت عباسؑ نے مسرت کی حالت میں تیغ و سپر اٹھالی۔ کمر سے پٹکا باندھ لیا۔ شاعر نے الفاظ سے کتنی صحیح

---

[1] محولہ بالا، دوسرا بند۔
[2] مطلع عباسؑ کو جہاد کی جس دم رضا ملی تعداد بند ۱۲۹
[3] محولہ بالا، دوسرا بند۔

مرقع کشی فرمائی. اسی خوشی کی وجہ سے یہ کیفیت بھی ہوئی کہ ذرہ تنگ ہو گئی۔ اندازِ بیان کس قدر دل کش ہے۔ بیت بار بار پڑھیئے ہر مرتبہ لطف آئے گا۔ ایک اور مرثیے کا چہرہ پیش کیا جاتا ہے جس میں شاعر نے تعلی سے بھی کام لیا ہے اور دنیا کی بے ثباتی کا بھی تذکرہ کیا ہے:۔

طبع روشن ہے مری شمعِ شبستانِ سخن — حسن بندش سے نمودار ہے لمعانِ سخن
نظم ہے دُرِّ گرانمایہ عُمّانِ سخن — ہے زبان بلبلِ خوش لہجۂ بستانِ سخن

سحر و شام عجب سیر کیا کرتا ہوں
مثلِ قمری اسی گلزار کا دم بھرتا ہوں[۵۱]

شوکتِ الفاظ اور ان کے برمحل استعمال کی وجہ سے شاعر کی قادر الکلامی کی داد دینی پڑتی ہے۔ پھر برجستہ محاورے کا استعمال سونے پر سہاگا۔

اب سنئے دنیا کی بے ثباتی کی بابت:

رنگ دنیائے دنی کے بھی عجائب دیکھے — جو نہ کانوں سے سنے تھے وہ غرائب دیکھے
کل جو حاضر تھے وہ آج آنکھوں سے غائب دیکھے — گر خوشی ایک تو سو رنج و مصائب دیکھے

غم کو ظاہر تو مسرت کو نہفتہ پایا
کسی محفل کو بھی جا کر نہ شگفتہ پایا[۵۲]

انقلابِ زمانہ کی کس قدر صحیح عکاسی ہے۔ زمانہ کسی سے وفا نہیں کرتا۔ کل تک جو حضرات زینتِ محفل تھے آج وہ اس سرائے فانی میں نظر نہیں آتے خوشی اور رنج کا امتزاج کس قدر صداقت پر مبنی ہے۔ اسی لئے انسان دنیا کے کسی گوشے میں بھی حقیقی خوشی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔

---

۵۱ مطلع "طبع روشن ہے مری شمع شبستان سخن" تعداد بند ۱۷۰

۵۲ حوالہ بالا، ساتواں بند

منظر نگاری :-

منظر وہ کیفیت ہے جو چند واقعات یا متعدد جزئیات سے پیدا ہو، شاعری میں منظر کشی کا مرحلہ نہایت اہم ہے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ شاعر کا مشاہدہ بہت وسیع ہو۔ منظر نگاری میں تنوع بھی ہونا چاہئے۔ میر نفیس کے مرثیوں میں منظر نگاری کے عمدہ عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں، جن کے مطالعے سے ان کی تخیل کی بلند پروازی اور ان کی قادر الکلامی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ طلوعِ سحر کا منظر ملاحظہ ہو:-

فراغ ماہ کو جب رات کے سفر سے ہوا فروغِ انجم تاباں نہاں نظر سے ہوا
تمام دہر منور رُخِ سحر سے ہوا ظہور مہر مبیں کوہ و دشت و در سے ہوا
وفورِ حسن سے چاروں طرف ضیاء پھیلی
جہاں میں روشنیٔ قدرتِ خدا پھیلی

وہ دور دور ریاض فلک وہ نورِ سحر وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور وہ ظہور سحر
وہ گلشنوں میں نوا سنجیٔ طیورِ سحر نقاب چہرے سے اٹھتے ہوئے وہ نورِ سحر
وہ نور حسن جو اپنا سماں دکھانے لگا
فلک پہ چاند خجالت سے منہ چھپانے لگا

صبح کا منظر کس قدر پرکشش و دلکش ہے۔ سویرے کا وقت ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ طیور عبادت خدا میں مصروف ہیں کوئی یا حق کہہ رہا ہے اور کوئی 'یا ہو'، جہاں میں ہر طرف قدرتِ خدا کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔

جب سپہر بریں پر ظہورِ صبح ہوا تو ضیائے کواکب پر نور صبح غائب ہوا اور شمع طور صبح کی روشنی زمین پر پھیل گئی اور خدیو صبح کے طالع بیدار ہو گئے۔

۲۔ سراپا :-

کردار نگاری میں کرداروں کا سراپا بھی شامل ہے۔ جس سے ان کی نفسیات اور

سیرت کا بھی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ سراپا میں شاعر اپنے ہیرو کے اعضائے جسمانی کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔ نادر تشبیہات اور تمثیلات کی تلاش میں وہ سرگرداں رہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر قلم اُٹھانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

میر نفیس[۱] نے ایک مرثیے میں حضرت عباس کا سراپا اس طرح نظم کیا ہے :-

حسنِ پیشانیٔ انور سے خجل مہر مبین
جس سے روشن ہے اُدھر چرخ اِدھر روئے زمین
ورقِ مصحفِ ناطق سحرِ مشرقِ دین
ہے نشان سجدۂ باری کا جو بالائے جبین
نخلِ گلزارِ عبادت کا ثمر ہے دیکھو
جلوہ گر یدِ بیضائے کفِ موسیٰ پہ گہر ہے دیکھو[۲]

عرشِ اعظم کو ضیاء دیتی ہے چہرہ کی ضیاء
اس میں ہے آئینۂ نورِ خدا کا جلوا
آفتاب و مہ تاباں کا بھلا ذکر ہے کیا
شرم گیں پھرتے ہیں دن رات یہ گردوں پہ پیدا
رُخ پہ دونوں کی نہ ٹھہرے گی نظر حشر تک
ایک تو منہ نہیں کرنے کا ادھر حشر تلک[۳]

ورقِ مصحف ناطق، اور سحر مشرق دین کی ترکیبیں کس قدر معنی آفریں ہیں پیشانی اقدس پر جو سجدہ کا نشان ہے اسے نخلِ گلزارِ عبادت کا ثمر کہہ دیا۔ اسی پر شاعر نے قناعت نہ کی بلکہ اس نشان میں یدِ بیضا، کی خاصیت ہے۔

آفتاب و ماہتاب حضرت عباس کے چہرے کی ضیاء کا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں ان کے چہرۂ اقدس پر بھلا نگاہ کیسے ٹھہر سکتی ہے۔

ایک مرثیے میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا سراپا ایک نئے انداز سے نظم

---

[۱] مطلع: "طبع روشن ہے مری شمع شبستان سخن"
[۲] حوالہ بالا، بند ۷
[۳] حوالہ بالا، بند ۵۶

کیا ہے :-

شانے ہیں کہ دو چاند ہیں بازو ہیں کہ تصویر
وہ ہاتھ کہ جن کے لئے پیدا ہوئی شمشیر
گردن کی ہے خواہش کہ چلے خنجر بے پیر
سینہ کو تمنا ہے کہ چھاتی پہ لگیں تیر

اعضا بھی سراپا ہیں طلب گار خدا کے
سر سجدہ کا مشتاق قدم - راہ رضا کے [۱]

راہِ رضا بڑی سخت اور مشکل ہے کیوں کہ وہ خنجر کی دھار پر ہے ۔ جب امام علیہ السلام سر بسجود ہوں اس وقت سوکھے گلے پر شمر کا خنجر چلے ۔

نفیس نے حضرت علی اکبر کا سراپا ایک مرثیے [۲] میں یوں نظم کیا ہے :-

چہرے کی ضیاء مہر کی تنویر سے بہتر
آواز ہے داؤد کی تقریر سے بہتر
دل دوزی میں ایک ایک پلک تیر سے بہتر
ابروئے کشیدہ خم شمشیر سے بہتر

ان کے شرف اللہ کے محبوب سے پوچھو
حسن ایسا جسے یوسفِ یعقوب سے پوچھو [۳]

حضرت علی اکبر کی تعریف انسان کے بس کی بات نہیں ۔

یہ فرق ہمایوں یہ جبیں اور یہ ابرو
یہ چشم یہ رخسار ضیا بار یہ گیسو
یہ لب یہ دہن اور قد و قامتِ دلجو
یہ پھول سا تن جس میں محمدؐ کی ہے خوشبو

شان ان کی وہ ہے جس پہ فدا عرش بریں ہے
جو عضو ہے اک سورۂ قرآن مبیں ہے [۴]

---

۱ مطلع " ہاں اے قلمِ صدق رقم نور فشاں ہو" تعداد ۱۷۴ ، بند ۷۵
۲ مطلع " اس ے کا ہوں نوشندہ کہ مستی نہیں جس میں ۔
۳ حوالہ بالا ، بند ۴۸
۴ حوالہ بالا ، بند ۴۹

شاعر حضرت علی اکبر کا سراپا تشبیہات کا سہارا لے کر بیان کرتا ہے بعد ازاں اسے اس کا احساس ہوتا ہے کہ مفہوم صحیح طریقے سے ادا نہ ہو سکا اس لئے شاعر نے کہہ دیا کہ "جو عضو ہے اک سورۂ قرآن مبیں ہے"۔ اس کے بعد تو کسی قسم کے اضافے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

۳۔ رخصت:۔

میدان جنگ میں جانے سے پہلے رفقاء اور اعزہ امام حسین علیہ السلام سے اجازت طلب کرتے، امامؑ کے عزیزان سے اجازت لینے کے بعد خیمہ میں بھی رخصت کے لئے جاتے۔

حضرت عباس کی رخصت کا منظر کس قدر دل خراش ہے۔ بچوں کے بین اور حضرت سکینہ کا مشک لا کر اپنے چچا کو دینا اور پانی لانے کے لئے اصرار کرنا کس قدر رقت انگیز بیان ہے۔

کہہ کے یہ آپ نے گودی میں بھتیجی کو لیا　　ہونٹ سے سوکھے ہوئے ہونٹ ملے پیار کیا
اور یہ فرما کے پھر آغوش میں زینبؑ کی دیا　　میری شہزادی نے پانی نہیں دو دن سے پیا
مشک بھرنے کے لئے نہر پہ جب جاؤں میں
تم دعا مانگو کہ اعدا پہ ظفر پاؤں میں [۱]

سب سے رخصت ہوئے خیمے میں علمدار امام　　مشک لے کر جو چلے پڑ گیا گھر میں کہرام
دیکھا زوجہ کو کہ بیتاب ہے وہ نیک انجام　　مڑ کے فرمایا نہیں گریہ و زاری کا مقام
رہو ہر رنج میں تم صابر و شاکر صاحب
ہم تو جاتے ہیں خدا حافظ و ناصر صاحب [۲]

---

[۱] مطلع "طبع روشن ہے مری شمع شبستان سخن" بند ۳۵

[۲] حوالہ بالا بند ۳۶

حضرت عباس امام حسین کے قریب جاتے ہیں اور دست ادب جوڑ کر فرماتے ہیں کہ یہ ارمان ہے کہ آپ پر فدا ہو جاؤں۔ حضور اجازت دیتے ہیں۔ رخصت کے بند پڑھے تو ان میں جذبات نگاری کے بھی عمدہ نمونے ملیں گے۔

روکے شہ بولے کہ قابو میں نہیں ہے دلِ زار ہائے کس منہ سے کہوں میں کہ ہو گھوڑے پہ سوار
آؤ ان شانوں کے بوسے تو میں لے لوں اک بار جسم سے جان چلی اب ہے سنبھلنا دشوار
خاک پر گرتے ہیں دم سینے میں گھبراتا ہے
جلد تھامو علی اکبرؑ ہمیں غش آتا ہے [۵۱]

یہ سن کر حضرت عباس بھی رو دیے آقا کے گرد پھرے اور جھک کر سلام کیا بعد ازاں
جلوہ فرما ہوا شبدیز پہ وہ نیک انجام

جب گلشن حیدر کو ستمگار لوٹ چکے صرف ہم شکلِ نبیؐ اور حسینؑ بن علی باقی رہ گئے۔ ان کی (امام کی) خواہش تھی کہ فرزند میدان جنگ میں نہ جائے اِدھر حضرت علی اکبر مُصر ہیں کہ ،، جنگ ،، کی اجازت جلد مل جائے کیوں کہ شہادت تو سعادت کا جادہ ہے۔ میری زندگی میں قبلہ کونین پر آنچ آئے ہیں کیسے برداشت کر سکوں گا۔

شہ نے کہا خیر اب ہمیں رو کر نہ رلاؤ
اچھا یہی مرضی جو تمھاری ہے تو جاؤ
لیکن ماں، بہنوں اور پھوپھیوں سے رخصت ہو آؤ۔

یہ سنتے ہی خیمہ میں وہ عالی گہر آیا ثابت یہ ہوا برج شرف میں قمر آیا
مادر کو جو فرزند کا چہرہ نظر آیا ہاتھوں کو تو پھیلا دیا دل غم سے بھر آیا
ہوش اپنا نہ تھا دھیان میں اس ماہ لقا کے
رونے لگیں دل بند کو چھاتی سے لگا کے [۵۲]

---

۵۱ حوالہ بالا، بند ۴۴
۵۲ مطلع ،، اس مے کا ہوں نوشندہ کہ مستی نہیں جس میں ،، بند ۳۶

حضرت زینب نے دوڑ کر آپ کی بلائیں لیں اور دریافت کیا کہ ہتھیار سج کر تن تنہا کہاں جارہے ہو آپ نے عرض کی کہ اعدا کے پرے رن سے بڑھے آتے ہیں ذرا جاکر انھیں دادا کی شجاعت کے جوہر دکھادیں ہم کو رخصت دیجئے، ہیں آپ کو پیارا ہوں کہ شبیر ہیں پیارے۔

دل ہل گیا بانو کا یہ بیٹے نے کہا جب | مظلومیٔ شبیر[1] پہ رونے لگیں زینب
ہاتھوں سے جگر تھام کے اکبر سے کہا تب | صدقے گئی سمجھی ہیں جو ہے آپ کا مطلب

غازی ہو مددگارِ شہ عرش نشین ہو
اب مجھ پہ کھلا - عازمِ فردوس بریں ہو[2]

اچھا میرے دلدار خدا حافظ و ناصر | حجت ہے نہ تکرار - خدا حافظ و ناصر
روتا ہے دلِ زار - خدا حافظ و ناصر | حیدر ہیں مددگار - خدا حافظ و ناصر

اب کوئی معینِ شہ بےکس نہیں بیٹا
ماں باپ کا تقدیر سے کچھ بس نہیں بیٹا[3]

جب شہزادہ علی اکبر روانہ ہوئے تو سیدانیاں نوحہ کناں تھیں۔ آپ خیمے سے باہر آئے تو:۔

دیکھا کہ کھڑے روتے ہیں سرور بصد افغان | جوڑے ہوئے ہاتھ آئے قریب شہ ذیشان
کی عرض کہ جاتا ہے غلام اب سوئے میدان | دل تھام کے فرمایا کہ اللہ نگہبان

فریاد ہے تم سے یہ پدر چھٹتا ہے بیٹا
تم جاتے نہیں سب مرا گھر لٹتا ہے بیٹا[4]

یہ کہہ کر اپنے جگر بند کو چھاتی سے لگا لیا جب سینے کے بوسے لیے تو بہت رونا آیا اور آ....

---

[1] حوالہ بالا ، بند ۱۳۱

[2] حوالہ بالا ، بند ۳۴

[3] حوالہ بالا ، بند ۳۷

بجا لاکر حضرت علی اکبر میدان جنگ کی طرف روانہ ہوئے۔

۴۔ آمد:-

ہیرو شان و شوکت سے میدانِ کارزار میں وارد ہوتا ہے۔

حضرت زینب کے دونوں صاحبزادے جسم پر ہتھیار سنوارے ہوئے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور

گھوڑوں کو جو کی دونوں نے مہمیز برابر
بجلی سے تڑپنے لگے شبدیز برابر
دو آ ہوئے چینی تھے جلوریز برابر
چالاک برابر تو سبک خیز برابر
ششدر تھا فلک دونوں کے سم اٹھتے تھے
تابان مہ نو چار ادھر چار اُدھر تھے [۱]

سرعت میں کہیں تیز غزالانِ خطا سے
اونچے کئی ہاتھ اوجِ سعادت میں ہما سے
اڑ جانے میں مڑ جانے میں بڑھ جانے میں جا سے
افزوں کہیں طاؤس سے بجلی سے ہوا سے
جنگل میں کبھی تھے تو کبھی چرخ بریں پر
سایا بھی پہنچتا تھا تو گر گر کے زمیں پر [۲]

تشبیہات کے علاوہ نفیس نے نازک خیالی اور تخیل کی بلند پروازی اور وسیع مشاہدے کا ثبوت دیا۔

چھٹا مصرع کس قدر فصیح و بلیغ ہے:-

سایہ بھی پہنچتا تھا تو گر گر کے زمیں پر

حضرت عباس علمدارِ لشکر کی آمد کا منظر ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت عباس شبدیز پر جلوہ فرما ہوئے ادھر آپ نے لجام دستِ مبارک میں لی کہ فرس گرم عنان ہو کر برق جہندہ

---

[۱] مطلع اے طور تجلائے سخن جلوہ گری کر (تعداد بند ۱۵۱) بند ۸۷

[۲] حوالہ بالا، بند ۸۹

بن گیا۔ جب رہوار بن بن کے پاؤں اُٹھانے لگا تو پریوں کے ہوش اڑ گئے۔ صبا اپنی چال بھول گئی بعدازاں

شیرِ خالق کے نشان نے علم اونچا جو کیا ... ہم بغل مہر سے جا کر ہوئی پنجے کی ضیاء
سر پہ غازی نے جو دامانِ علم کھول دیا ... ابرِ رحمت نے علمدار کو سایہ میں لیا
خوبیاں لہر پھریرے کی جو دکھلانے لگی
موجِ کوثر کی، فدا ہونے پہ لہرانے لگی[1]

دوش پر تیغ بہادر نے رکھی مثلِ علیؑ ... رخش جاں باز اڑا فتح وظفر ساتھ چلی
سطوت ورعب وجلالت سے یہ گویا تھا جلی ... غزدۂ ذاتِ سلاسل پہ چلے حق کے ولی
غل تھا یہ ہیں وہ بشر جن کے ملک خادم ہیں
رخ سے روشن تھا کہ یہ ماہ بنی ہاشم ہیں[2]

ان کے نور کے حسن سے سارا جنگل روشن ہو گیا۔ عکس رخسار سے صحرا گلشن بن گیا۔ دشت کا سارا دامن بوئے گیسو سے عطر فشاں ہو گیا ان کے چہرے کی ضیاء کے مقابلے میں آفتاب وماہتاب کی بھلا کیا حقیقت بھی دن رات یہ دونوں گردوں پر "شرم گیں" پھرتے ہیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام معرکہ کارزار میں کس طرح تشریف لے جاتے ہیں۔ آپ نے رہوار کی باگ اٹھائی تو اس کی سرعت سے موجِ نسیم سحری گرد ہو گئی۔ رخش نہیں تھا بلکہ ہوا ابر برق کی تصویر تھی۔ سیماب کی مانند اس کو نہ قرار تھا نہ آرام۔ وہ فرس دلدل کی طرح معرکہ آرا تھا۔ رسولِ دوسرا کی عبا امام حسین کے دوشِ مبارک پر تھی۔ اس طرح آپ وارد میدان ہوئے۔

اللہ رے اجلال و نہیبِ شہِ ذیشاہ ... تنہا ہیں پہ تھراتا ہے سب لشکر بدخواہ

---

[1] مطلع طبع روشن ہے مری شمع شبستانِ سخن، بند ۴۷

[2] حوالہ بالا، بند ۴۸

گرز و تبر و تیر و سناں بھی نہیں ہم راہ　　　آنکھوں میں ہے یہ رعب کہ اَلعَظمۃُ لِلّٰہ

فرزند ہیں اس کے جو شجاعِ ازلی ہے

حمزہ کی فقط ڈھال ہے اور تیغ علیؑ ہے[1]

جب آپ میدان میں تشریف لے گئے تو دشمنوں کی برچھیاں ہٹ ہٹ گئیں اور ان کی صف، صف سے مل گئی۔

۵ - رجز :-

عربوں کے قدیم دستور کی طرف اشارہ ہے جب میدان کارزار میں مبارزطلبی کی صدائیں گونجتیں تو مخالف افواج کے پہلوان اپنے اپنے بزرگوں کے کارنامے اور ان کا حسب نسب فخریہ انداز میں بیان کرتے بعد ازاں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو جاتے۔

"رجز" مرثیے کا جزو بن گیا۔ شاعر کی جولانی فکر کے لئے یہ میدان نہایت وسیع ہے جہاں اس کا اشہب قلم کبھی کبھی بے لگام بھی ہو جاتا ہے۔ اندازِ فکر میں جدت پرشکوہ الفاظ اور ڈرامائی انداز "رجز" کو موثر بنانے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام افواج روم و شام سے یوں مخاطب ہوتے ہیں :

تم کیا ہو اگر ایک طرف دونوں جہاں ہوں　　　اس تیغ کی دہشت سے طلب گارِ اماں ہوں

ہٹ جائیں اشارے میں جو سو کوہِ گراں ہوں　　　میں چاہوں تو آثار قیامت کے عیاں ہوں

صحرا ہو نہ دریا نہ مکاں ہو نہ مکیں ہو

بے چوبہ گردوں ابھی پیوند زمیں ہو[2]

'امام مبین' تو خشک و تر کا مالک ہوتا ہے چاند سورج زمین و آسمان اس کے احکام کے پابند ہوتے ہیں اس کے ایک اشارے سے دنیا میں انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔

---

[1] مطلع 'ہاں اے قلم صدق رقم نور فشاں ہو'، بند ۴۵

[2] حوالہ بالا ، بند ۶۳

آپ نے اپنے پدر بزرگ وار حضرت علی کے کارناموں کی یاد دلائی خیبر و خندق کی لڑائیوں کے علاوہ انھوں نے جنوں سے بھی لڑائی کی تھی اور ان کو شکست دی تھی۔

ہم خیبر و خندق میں اکیلے ہی لڑے ہیں | پانی تو ہے کیا آگ میں ہم کود پڑے ہیں
دبتے ہیں وہ فولاد سے دل جن کے کڑے ہیں | تھراتے ہیں رستم سے بہادر جو بڑے ہیں

ہے خالق اکبر کا غضب حرب ہماری
جبرئیل سے رد کی نہ گئی ضرب ہماری [1]

ذوالفقار کی ضرب کی تاب جب فرشتے نہ لا سکے تو بھلا بشر کی کیا طاقت وہی ذوالفقار آج نیام سے نکلی ہے۔

نفیس کے ایک مرثیے سے حضرت عباس کی رجز کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں:

تو بڑھا رن سے دل و جانِ شہنشاہ عرب | لو کھلے صفدر و غازی کے رجز میں وہی لب
ایک نعرے میں زمین کیا فلک ہل گئے سب | مشک دکھلا کے صدا دی یہ بصد غیظ و غضب

جو نہیں لاکھوں سے رکتا وہ دلیر آتا ہے
دور ہو جاؤ ترائی سے کہ شیر آتا ہے [2]

اسی غیظ کی حالت میں آپ فرماتے ہیں:

تول کر تیغ بڑھے گا جو ید اللہ کا لال | خود ٹھہرنا تمھیں ہو جائے گا دریا پہ محال
سامنے چشمہ ہے اور بیچ میں ہیں چند شغال | شیر کو دیکھ کے رم کرتے ہیں جنگل کے غزال

گر نہ بھاگو گے تو بچنے کا کوئی طور نہیں
ہم علی کے ہیں جگر بند کوئی اور نہیں [3]

حضرت علی کی تلوار کا لوہا ساری دنیا مانے ہوئے ہے ان کی شجاعت پر خیبر خندق

---

[1] حوالہ بالا، بند ۶۳
[2] مطلع "طبع روشن ہے مری شمع شبستان سخن" بند ۵۹
[3] حوالہ بالا، بند ۶۱

کے معرکے گواہ ہیں ہم بھی توانہی کے خلف ہیں اس لیے :

زور اپنا ہے عیاں غرب سے تا سرحدِ شرق
توڑ دیں سدِّ سکندر کو ہم اس میں نہیں فرق
خون میں ڈوبیں گے جو فولاد کے دریا میں ہیں غرق
سرد ہو جائے گی تلواروں کی خود آتش برق

زور لشکر کا ہو پانی وہ دلاور ہیں ہم
بحرِ آہن میں جو پیرے وہ شناور ہیں ہم [1]

ہے کسی میں ہم سے مقابلے کی جرأت۔

حضرت علی اکبر کے رجز کے بھی دو بند سن لیجئے :

ہم وہ ہیں کہ مرحب سے دلاور کو پچھاڑیں
ڈالیں جو کڑی آنکھ تو چہرے کو بگاڑیں
سر کیں نہ جگہ سے جو قدم کھیت میں گاڑیں
سو قلعہ جو خیبر سے ہوں بھاری تو اکھاڑیں

پروا نہیں گر کوئی نہیں ساتھ ہمارے
طاقت میں کہیں بند نہیں ہاتھ ہمارے [2]

خیبر و خندق ہمارے جدامجد حضرت علیؑ کی بہادری کے گن گاتے ہیں ہم میں بھی زور اسد الٰہی ہے ہم کو کثیر افواج کی کیا پروا ہم اکیلے سہی ۔ پھر بھی کوئی ہمارے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا۔

یہ بھی یاد رہے :

رن سے اسد اللہ کے پیارے نہیں ہٹتے
گردوں پہ جو ثابت ہیں ستارے نہیں ہٹتے
کفار کو بے جان سے مارے نہیں ہٹتے
بڑھتے ہیں تو پھر پاؤں ہمارے نہیں ہٹتے

دے جن کو خدا اوج وہ جھکتے ہیں کسی سے
بہتے ہوئے دریا کہیں رکتے ہیں کسی سے [3]

---

[1] مطلع " طبع روشن ہے مری شمع شبستان سخن " بند ۶۸

[2] مطلع " اس مے کا ہوں نوشندہ کہ مستی نہیں جس میں " بند ۱۷

[3] حوالہ بالا ، بند ۴۷

نفیس کے مختلف مرثیوں میں کثرت سے رجزیہ اشعار ملیں گے لیکن طوالت کے خوف سے نقل نہیں کئے جا رہے ہیں۔

۶۔ رزم :۔

ہیرو میدان کارزار میں نبرد آزما ہوتا ہے۔

رزمیہ شاعری میں ہیرو کے رخش اور اس کی تلوار کی تعریف کی جاتی ہے اس لئے یہ لازمی ہے کہ شاعر کے پاس الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود ہو۔ وہ فنون جنگ اور اسلحہ جنگ سے کما حقہ واقفیت رکھتا ہو اور شہ سواری سے بھی، تاکہ رزمیہ شاعری کی مرقع کشی سے وہ بخوبی عہدہ برآ ہو سکے۔ مضامین کی جدت۔ خیالات کی ندرت اور طبع کی ذہانت سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ نفیس نے ایک مرثیے میں حضرت عباس کے رخش کی یوں تعریف فرمائی :

پاؤں بن بن گئے وہ رہوار اٹھانے جو لگا　　　ہوش پریوں کے اُڑے بھول گئی چال صبا
جست میں آ ہوئے تاتار۔ سعادت میں ہما　　　خم گردن مہ نو چاند سے روشن ماتھا
جلد نازک پہ چھڑی پھول کی بھی بھاری تھی
چہرۂ حور پہ آنچل تھا کہ اندھیاری تھی [1]

شاعر نے کیسی نادر تشبیہات استعمال کیں تشبیہ کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ مشبہ کی رفعت کا اظہار تشبیہہ سے ہو جائے۔ اور جس غرض سے مشبہ کا ذکر مقصود ہو اس بیان میں تشبیہہ سے مزید اثر پیدا ہو جائے۔ اسی مرثیے میں تلوار کی تعریف میں دو بند ملاحظہ ہوں :۔

وہ چمک اس کی وہ عباس دلاور کا جلال　　　تھا نمایاں کہ اٹھا دست علی بہر جدال
ضو خم تیغ کی ظاہر جو ہوئی شکل ہلال　　　انگلیاں اُٹھ گئیں حیران ہوئے سب اہل ضلال

---

[1] مطلع۔ طبع روشن ہے مری شمع شبستان سخن " بند ۴۶

غل تھا حیرت کا سماں چرخ نے دکھلایا ہے
چاند انتیس کا دسویں کو نظر آیا ہے [۱]

شاعر نے تیغ کو ہلال سے تشبیہہ دی ہے اس کے ذہن رسا کا اس سے بھی علم ہوتا ہے کہ وہ ایسی چیز سے تشبیہہ دے رہا ہے جتنی باتیں مشبہ بہ میں ہوں اسی قدر یا اس سے ملتی جلتی باتیں مشبہ میں مل جائیں۔

انتیس کا چاند بمشکل دکھائی دیتا ہے۔ اسے دیکھ کر اس کی طرف بے ساختہ انگلیاں اٹھ جاتی ہیں "ہلال" میں کجی بھی ہوتی ہے اور چمک بھی۔ یہی حال تلوار کا ہے حضرت عباسؑ کی تلوار کے جوہر دیکھ کر دشمن انگشت بدنداں ہیں۔ نفیس کے ایک دوسرے مرثیے سے رہوار اور تلوار کی تعریف میں چند بند نقل کئے جاتے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام کے رخش کے بارے میں:

وہ تخت سلیمان تھا کہ رہوار سبک رو — تھا زین مرصع سے خجل مہر کا پرتو
سم بدر فلک قدر تو ہر نعل مہ نو — وہ جست وہ سرعت وہ طرارے وہ تگ و دو
ممکن تھی زمانے کی سیاحت اسی دم میں
بہتے ہوئے دریا کی روانی تھی قدم میں [۲]

سیماب کی صورت نہ قرار اس کو نہ آرام — چالاک و گراں قدر سبک سیر و گل اندام
یہ فاصلۂ شش جہت اس کے لئے دو گام — مشرق میں کبھی صبح تو مغرب میں کبھی شام
جو عرش کا مالک ہے وہ سردار ہے اس کا
خورشید بھی اک غاشیہ بردار ہے اس کا [۳]

---

۱ مطلع۔ "طبع روشن ہے مری شمع شبستان سخن" بند ۷۵

۲ مطلع، "ہاں اے قلم صدق رقم نور فشاں ہو" بند ۳۵

۳ حوالہ بالا، بند ۳۶

رخش کی سرعت کی بھلا کیا تعریف کی جا سکتی ہے فاصلۂ شش جہت تو وہ چشم زدن میں طے کر سکتا ہے۔ اسے اسوار کے دل کا اشارہ کافی ہے اس کی سج دھج کو دیکھ کر:

غل تھا کہ ہوا آج دلھن بن کے چلی ہے

امام حسین علیہ السلام کی تلوار کی تعریف بھی نفیس کی زبان سے سنئے:

تیغ ایسی جہاں خم ہے خجالت سے مہ نو — سیفی کا اثر رکھتا ہے جس مہر کا پرتو
دو اس کی زبانیں ہیں مگر خوبیاں سو سو — مقراضِ اجل شعلۂ سرکش ہمہ تن ضو
ہر صف پہ صفیں گرتی ہیں رن پڑتا ہے رن پر
چلتی ہے نئی قطع سے یہ جامہ تن پر[1]

تیزی بھی لگاوٹ بھی۔ سخاوت بھی ستم بھی — غصہ بھی جلالت بھی غضب بھی چم و خم بھی
بے باکی بھی۔ چالاکی بھی طراری بھی دم بھی — پانی بھی۔ جلانے کے لئے آگ بھی۔ سم بھی
سر ایک کا ثابت صف دشمن میں نہ چھوڑے
لاکھوں ہوں تو یہ جان کسی تن میں نہ چھوڑے[2]

جس وقت جنگ کے میدان میں تلوار کھنچ گئی تو دشمنوں کے قدم اکھڑ گئے، اس کے کون کون سے اوصاف بیان کئے جائیں یہ "جان سوز" بھی ہے اور "جہاں سوز" بھی "جگر سوز" بھی ہے اور "عدو سوز" بھی اس نے اہل جفا کی صفیں شعلوں سے جلا دی تھیں، یہ خدا کی قدرت نہیں تو اور کیا ہے کہ لوہے میں آگ کا اثر ہے کیا تعریف ہو سکتی ہے اس تلوار کی

گھاٹ ایسا کہ کیا منہ کوئی زندہ جو اتر جائے — باڑھ ایسی کہ دیکھے ملک الموت تو ڈر جائے
زہر ایسا کہ پی کر جسے افعی ہو تو مر جائے — دم ایسا کہ دم بھر میں پرے خون سے بھر جائے

---

1. حوالہ بالا، بند ۵۰
2. حوالہ بالا، بند ۵۱

خود ہو گیا وہ سیف زبان جس نے ثنا کی
نابیں یہ نہیں موج ہے دریائے فنا کی[1]

الغرض یہ تلوار اعدا پر منہ کھول کر اس طرح آتی ہے۔ جیسے شاہین اپنے صید پر پر تول کر اس تلوار نے افواج میں ہلچل مچادی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جانبازوں نے جی چھوڑ دیے اور ایک تیغ نے دو لاکھ دشمنوں کے منہ موڑ دیئے۔ پر دغا اور مکار دشمن اپنا منہ چھپائے پیچھے ہٹ رہے تھے تلوار نے یہ اپنا سکہ بٹھایا تھا۔ اجل خود فوج دغاساز کا جائزہ لے رہی تھی اور قضا ہر طرفی کے پروانے بانٹ رہی تھی۔

آتش بھی ہے پانی بھی کرامات ہے یہ تو   یاں گھاٹ پہ دھارا ہے نئی بات ہے یہ تو

غرض تیغ سیل فنا ہے اس کی باڑھ وہ آفت ہے جسے بلا کہتے ہیں اس کا منہ قضا کا منہ ہے جس کے سر پہ یہ آتی ہے جان لئے بغیر نہیں جاتی اور یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ سر پر کب آئی۔ وہ "دشمن کش" بھی ہے اور "قتال بھی" "بے درد" بھی ہے اور "دل آزار" بھی "سفاک" بھی ہے اور "جہانگیر" بھی۔ اس کی ایک چال پر کتنے ہی گلے کٹ گئے۔

معرکہ کارزار:۔

معرکہ کارزار کی بھی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں تاکہ رزم کے مفہوم کی صحیح طریقے سے وضاحت ہوسکے۔

حضرت عباسؑ میدان کارزار میں تشریف لاتے ہیں۔ ان کی نگاہیں دشمنوں کے لئے "تیغ خشم" ہیں اسی لئے تو معرکہ کارزار کا یہ حال ہوا کہ:۔

نقارے سرنگوں تھے سر خاک ہر طرف   غوغائے زیر و بم تھا نہ آواز کوس و دف
تھا ناوکِ شکستہ کا ایک ایک دف ہدف   سب تھے دُھل دُھل کے دُھل چپ میان صف

---

[1] حوالہ بالا، بند ۵۳

پھیلی تھی نارِ قہر جو مقتل کی راہ میں
قرنا بھی پھنک کے رہ گئی تھی رزم گاہ میں ۱؎

حضرت عباس جب نہر فرات پر پہنچے تو وہاں حشر کا ساماں نظر آرہا تھا:

لو آئے روکنے کو جفا کار گھاٹ پر چلنے لگی دلیر سے تلوار گھاٹ پر
لو کوندتی ہے برقِ شرر بار گھاٹ پر لو تن سے اڑتے ہیں سرِ کفار گھاٹ پر
بے حال پہرے والے ہیں سارے فرات کے
اب خون برس رہا ہے کنارے فرات کے ۲؎

نتیجہ یہ ہوا:۔

پل بندھ گئے ہیں لاشوں کے سر سو کنار جو کاٹے پڑے ہیں تیر سہ پہلو کنار جو
مضطر ہیں مثلِ موج جفا جو کنار جو جانوں سے ہاتھ دھوئے ہیں بدخو کنار جو
پیچھے ہٹا ہے ڈر کے جو لشکر لڑائی میں
آدھی ہے فوج نہر میں، آدھی ترائی میں ۳؎

حضرت امام حسین علیہ السلام کی رجز خوانی کے بعد معرکہ کارزار کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے:۔

بجنے لگے باجے، کہ گرجنے لگے بادل میدان سے بڑھا گرزِ گراں لے کے ہر اک یل
آواز سے گھوڑوں کی لگا گونجنے جنگل طائر بھی درختوں سے اڑے ہل گیا مقتل
مسکن جو یداللہ کی شمشیر نے چھوڑا
گھبرا کے ترائی کو ہر اک شیر نے چھوڑا ۴؎

۱؎ مطلع "پھر بادشاہِ ملکِ سخن حکمران ہے آج" بند ۱۰۹
۲؎ حوالہ بالا " بند ۱۱۳
۳؎ حوالہ بالا " بند ۱۱۵
۴؎ مطلع یا اللہ اے قلم صدق رقم نور فشاں ہو" بند ۶۷

وقت زوال ہے امام حسین کی تلوار چل رہی ہے۔ سید کو جلال آگیا اس لئے غرب سے شرق تک فریاد کا غل مچا ہوا ہے میدان کارزار کی کیفیت ملاحظہ ہو:

لو چل گئی تلوار کٹے ہاتھ اڑے سر — نازل ہوا ادبار کٹے ہاتھ اڑے سر
پسپا ہوئے کفار کٹے ہاتھ اڑے سر — صف ہو گئی بے کار کٹے ہاتھ اڑے سر
پر خون کہیں بازو ہیں، کہیں شانے پڑے ہیں
ریتی پہ تو سر، خود پہ دستانے پڑے ہیں [1]

شبیر جدھر آئے تلاطم نظر آیا — یہ غول گریزاں وہ پرا گم نظر آیا
سب زیر و زبر مجمع مردم نظر آیا — جو سر تھا فلک پردہ تہہ سم نظر آیا
تقدیر نے آسائش ہستی نہ دکھائی
تلوار نے کس اوج کو پستی نہ دکھائی [2]

شمشیر خداداد کا کیا کہنا دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے نہ ہاتھ کی تعریف ہوسکتی ہے نہ تیغ براں کی نہ حرب و ضرب کی۔

لڑتا ہے وہ صفدر جو شجاع ازلی ہے — جو تیغ کو حاصل ہے اصالت وہ جلی ہے
خیبر کی دغا میں سر مرحب پہ چلی ہے — کس طرح سے حاسد نہ جلیں۔ تیغ علیؑ ہے
مشتاق نہ دریا کی نہ خواہان لب جو کی
پانی تو خود اس میں ہے وہ پیاسی لہو کی [3]

۷۔ شہادت :-

امام حسین علیہ السلام کے کسی نہ کسی رفیق یا عزیز کی شہادت کا بیان ہوتا ہے سب کے بعد امام مظلوم کی شہادت واقع ہوتی ہے:

۱۔ حوالہ بالا ، بند ۷۸
۲۔ حوالہ بالا بند ۸۰
۳۔ حوالہ بالا ، بند ۸۹

ہر مرثیہ ہیرو کی شہادت پر ختم ہوتا ہے لیکن اس پر صحیح معنی میں المیہ کا اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ مرثیہ گو کی کوشش ہوتی ہے کہ واقعات شہادت سُنا کر روح کی جِلا کرے۔ انسان میں جوش و ولولہ پیدا کرے اور اسے اخلاقی درس بھی دے تاکہ اس میں قربانی اور ایثار کا جذبہ موجزن ہو جائے کیونکہ، شہادت ہی مطلوب و مقصود مومن، شہادت کے بارے میں نفیسؔ مرحوم کے مختلف مرثیوں سے چند بند نقل کئے جاتے ہیں۔

حضرت عباس علمدار لشکر ہیں ان کی شہادت کے بارے میں چند بند نقل کئے جاتے ہیں۔ حضرت عباس مشکیزہ لے کر نہر فرات پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس میں پانی بھر لیتے ہیں۔ خیمہ کا ارادہ کرتے ہیں۔ اتنے میں فوجِ ستم سمٹ آتی ہے اور آپ کو گھیر لیتی ہے۔

ایک راوی نے یہ لکھا ہے بصد درد و بکا　　آڑ میں نخل کی کھڑا تھا ایک شقیِ دوسرا
اس کا تیغہ جو پڑا دستِ یمیں قطع ہوا　　شل پرنالے کے شانے سے لہو بہنے لگا
آہ بھی منہ سے نہ کی ظلم کی ایذا سہہ کر
جھک گئے مشک پہ یا حافظ و ناصر کہہ کر[۱]

ناگہاں سر پہ لگا گرزِ گراں۔ ہائے غضب　　شق ہوا فرقِ علمدارِ جواں ہائے غضب
گر پڑا گھوڑے سے وہ سرورِ رواں ہائے غضب　　پھٹ گئے زخم تنِ شبر زیاں ہائے غضب
خاک سے دست بریدہ بھی اٹھے پہلو میں
مشک بھی چھاتی پہ اور ہاتھ گئے پہلو میں[۲]

شہادت کی تفصیلات بھی شاعر نے پر درد الفاظ میں اس طرح بیان کیں کہ اس کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ لاجواب مرقع کشی ہے۔

حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کا حال بھی سنتے چلئے:

---

[۱] مطلع "طبع روشن ہے مری شمع شبستان سخن" بند ۱۴۶

[۲] حوالہ بالا - بند ۱۴۹

میدان کارزار میں حضرت علی اکبرؑ کی جنگ بھی یادگار تھی اور یہ غل ہونے لگا کہ یہ تو حیدر کرار کی لڑائی ہے، ان کی جنگ دیکھ کر خیبر کی جنگ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اس وقت ابن سعد نے لشکریوں کی جرأت کو للکارا اور کہا کہ تم سب مل کر حملہ کرو۔ یہ سن کر:

ناگاہ پئے قتل بڑھے دو ستم ایجاد — تھا ایک سنان ابن انس اک بن وقاد
دونوں کے برابر سے چلے نیزۂ بیداد — پیغام اجل آگیا فریاد ہے فریاد
دو صدمہ تازہ ہوئے اس رشک قمر پر
اک دل پہ سناں چل گئی اور ایک جگر پر [1]

اب کیا کریں دو گھاؤ لگے سینہ پہ کاری — چھاتی سے بھی اور پشت سے بھی خون ہوا جاری
بند آنکھیں ہوئیں، رک گیا دم غش ہوا طاری — پھر تیغ جبیں پر کسی بے رحم نے ماری
دنیا ہوئی تیرہ نظر تشنہ گلو میں
تر ہو گئے سب چاند سے رخسار لہو میں

اس لئے نہ تو حضرت علی اکبر کے سینے میں دم سماتا ہے اور نہ گھوڑے پر سنبھلا جاتا ہے، ہاتھ بھی تھراتے ہیں اور منکا بھی ڈھلا ہوا ہے آخر کار آپ گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے اور

سر کاٹنے مقتل سے بڑھی ہے سپہ شام

آخری شہید کی بابت بھی چند بند پیش کئے جاتے ہیں۔

جب امام حسین علیہ السلام نے بہت سے اہل ستم کو جہنم واصل کیا تو غنیم کے لشکریوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ چلانے لگے یہ لڑائی نہیں بلکہ خدا کا قہر ہے اور دہائی دینے لگے۔ اس کے بعد نفیس کی زبانی سنئے:

---

[1] نسخہ: "اس ہے کا ہوں نوشتہ کہ مٹتی نہیں جس میں" بند ۸۴

جس وقت دہائی کی سُنی آپ نے آواز قربان رحیمی کے تھمے شاہِ سرافراز

فرمایا کہ اے فرقۂ مکار و دغا باز ہم صبر میں بھی سارے زمانے سے ہیں ممتاز

اک سینہ پہ دو لاکھ اگر تیر پڑیں گے

تم جنگ سے عاجز ہو تو اب ہم نہ لڑیں گے[1]

یہ کہہ کر آپ نے ذوالفقار نیام میں رکھ لی اور حضرت حمزہ کی سپر زین سے لٹکا دی شمر موقع کی تلاش میں تھا اس نے لشکریوں کو آواز دی "آؤ شیرِ مردان کے پسر کو آکر گھیر لو یہ سن کر سوار پلٹ آئے اور اس ابرِ کرم پر تیروں کا مینہ برسنے لگا اس کے بعد:

ظالم جو بڑھے تیغ بکف فوج کی صف سے رونے کی صدا آنے لگی ارض نجف سے

آرام چھٹا روحِ رسولانِ سلف سے مجروح کو پھر گھیر لیا چار طرف سے

جلّادوں میں آغوشِ محمدؐ کا پلا تھا

خنجر تو کئی تیز تھے اور ایک گلا تھا[2]

۸۔ بین پر مرثیہ کا اختتام ہوتا ہے:۔

ابتدائی دور میں دکن میں جو مرثیے لکھے گئے۔ ان کا مقصد صرف بین ہوا کرتا تھا۔ شمالی ہند میں مرثیے نے ترقی کی اور اس میں متعدد نئے اجزا شامل ہوئے جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن "بین" مرثیہ کا لازمی جز قرار پایا جسے کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

نفیس کے مختلف مرثیوں سے چند بند نقل کئے جاتے ہیں جن میں شہیدوں پر بین کا تذکرہ ہے۔ حضرت عباسؑ کی شہادت واقع ہونے کے بعد نفیس نے بین اس طرح پیش کئے:۔

---

[1] مطلع: "ہاں اے قلم صدق رقم نور فشاں ہو" بند ۱۰۳

[2] حوالہ بالا، بند ۱۱۷

ہاں غلامانِ علیؑ چپ نہیں رہنے کی یہ جا | مر گئے حضرت عباسؑ کرو آہ و بکا
ننگے سر گھر سے نکل آئے ہیں سب آلِ عبا | روتے آتے ہیں ترائی سے امامِ دوسرا

ساتھ اندوہ و غم و درد و الم لاتے ہیں
لاش دریا پہ رہی مشک و علم لاتے ہیں[1]

خیمۂ اہل بیت کی کیفیت کس قدر دلدوز اور روح فرسا ہے:

آئے حضرت جو لئے مشک و علم ڈیوڑھی پر | دیکھا سب بچے ہیں نکلے ہوئے گھر سے باہر
بڑھ کے پوچھا یہ سکینہ نے بحالِ مضطر | ہے غضب مشک مری کس کے لہو سے ہوئی تر

دیر سے میں ہوں گھڑی آس لگائے بابا
نہر سے میرے چچا جان نہ آئے بابا[2]

شاہ نے سر سے عمامہ کو پٹک کر یہ کہا | جام خالی کو بس اب پھینک دو پانی کیسا
چاک کرتے کا گریباں کرو اے ماہ لقا | منتظر کس کی ہو مارے گئے بی بی کے چچا

نہر پر سوتے ہیں منہ تم کو دکھانے کے نہیں
گھر میں عباسؑ علمدار اب آنے کے نہیں[3]

حضرت عون و محمد کی شہادت سے خیام اہلبیت میں کہرام مچ گیا جب یہ خبر پہنچی کہ شاہ ان کے لاشے خیمے میں لا رہے ہیں۔ اس وقت

رانڈیں صف ماتم پہ سب آئیں جو کھلے سر | گھبرا کے یہ کہنے لگی شبیرؑ کی خواہر
کیوں بیٹھی ہو چھاتیاں کوٹو ابھی دم بھر | پروا نہیں کچھ مجھ کو لٹا گھر تو لٹا گھر

ہے ہے نہ کرو صاحبو گھبرائیں گے شبیرؑ
آتے بھی ہیں تو شرم سے گڑ جائیں گے شبیرؑ[4]

۱؎ مطلع "طبع روشن ہے مری شمع شبستان سخن"، بند ۱۶۱
۲؎ حوالہ بالا، بند ۱۶۸
۳؎ حوالہ بالا بند ۶۹،
۴؎ مطلع اے طور تجلائے سخن جلوہ گری کر، بند ۱۴۶

بچّوں کی لاشوں کو دیکھ کر اہل حرم پر کیا گزری یہ نفیسؔ کی زبانی سنئے :

یہ ذکر تھا جو لاشوں کو لائے شہِ ابرار
جس صف پہ بہن تھی وہیں آئے شہِ ابرار
خود شرم سے تھے سر کو جھکائے شہِ ابرار
پرخون تھا گریبانِ قبائے شہِ ابرار
اک حشر تھا سر اہل حرم کھوئے ہوئے تھے
لاشوں پہ علمدار علم کھوئے ہوئے تھے[1]

امام حسین علیہ السّلام کی شہادت کے بعد کیا کیفیت ہوئی اس کا کچھ اندازہ لگانے کے لئے چند بند نقل کئے جاتے ہیں :-

ظالم جو بڑھے تیغ بکف فوج کی صف سے
رونے کی صدا آنے لگی ارض نجف سے
آرام چھٹا روحِ رسولانِ سلف سے
مجروح کو پھر گھیر لیا چار طرف سے
جلادوں میں آغوش محمد کا پلا تھا
خنجر تو کئی تیز تھے اور ایک گلا تھا[2]

قاتل نے گلے پر جو رکھا خنجر خونخوار
تھرائی زمیں یوں کہ ہلا گنبد دوّار
چلائے فرشتے کہ ہوا حشر نمودار
اے اہلِ زمیں بند کرو دیدۂ خونبار
اٹھے نہ زمانہ غضب رب صمد سے
لو فاطمہؑ سر کھول کے نکلی ہیں لحد سے[3]

ساقی نامہ :-

میر نفیسؔ کی اخاذ اور جدّت پسند طبیعت چہرہ لکھنے پر قانع نہ رہ سکی اور انھوں نے بڑے غور و خوض کے بعد ساقی نامہ لکھنا شروع کیا ساقی نامہ مثنوی کے لوازمات میں سے

---

[1] حوالہ بالا ، بند ۸۴

[2] مطلع " ہاں اے قلم صدق رقم نور فشاں ہو " بند ۱۱۷

[3] حوالہ بالا ، بند ۱۱۸

ہے۔ اور مثنوی کے عنوانات میں ساقی نامے کے سوا کچھ اور چیزیں بھی ہیں انھیں میں سے ایک موضوع خمریات بھی ہے جس کا ذیلی عنوان ساقی نامہ ہے۔ خمریات میں شاعر ساقی، ساغر و مینا، جام، درد تہ جام، خم و سبو وغیرہ کا تذکرہ کرتا ہے۔ پیر مغاں اور محتسب مے کدہ کی کیفیات بیان کرتا ہے۔

عربی زبان میں ابو نواس کی خمریات کافی مشہور ہیں۔ ابو نواس کا اثر دوسرے فارسی شعرا پر پڑا۔ عمر خیام کی رباعیات بھی اسی زمرے میں شامل ہیں۔ "تصوف اسلامی کے ہمہ گیر رواج نے فارسی شاعری میں خمریات کو حقیقت اور مجاز کا ایک آمیزہ بنا دیا پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) تک خمریات کی اصطلاحات حقیقی معانی لئے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد بیشتر یہ اشاراتی اور رمزیہ زبان بن جاتی ہیں اور اس طرح ساقی نامہ کا وجود آتا ہے۔"[1]

اس گوشے کو بہت وسعت دی اور

میر نفیس نے مرثیہ میں کے ساقی نامے کی ایجاد کا سہرا میر نفیس کے سر ہے۔ انھوں نے ساقی نامہ کا [redacted] کے اپنی جدت طبع اور اختراع کا ثبوت دیا۔ شاعر کے ساقی۔ ساقی کوثر ہیں، جب وہ معرکۂ جنگ کا نقشہ کھینچنا چاہتا ہے تو اپنے ساقی سے "مے زلال" طلب کرتا ہے تاکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔ نفیس کے مرثیوں سے "ساقی نامہ" کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ حضرت عباس میدان جنگ میں شجاعت کے جوہر دکھا رہے ہیں مقتل کی راہ میں نار قہر پھیلی ہوئی تھی، قرنا بھی رزم گاہ میں پھنک کے رہ گئی تھی۔ اب سنئے نفیس کی زبان سے ساقی سے خطاب:

ہاں ساقیا زلال مے ناب چاہیئے — موتی سے جو کہ صاف ہو وہ آب چاہیئے
دارو ئے صحت دل بیتاب چاہیئے — برسائے خون وہ تیغ ظفر یاب چاہیئے

۱؎ ریاض، ڈاکٹر محمد: "اقبال کے ساقی نامے" ماہ نو، کراچی: اپریل ۱۹۷۱ء، ص ۳۶

ہو فتح بازوئے شہِ والا صفات کی
باقی ابھی لڑائی ہے نہر فرات کی[1]

ایک دوسرے مرثیہ کا موضوع بھی حضرت عباسؑ ہیں۔ "ساقی نامہ" سے ایک بند پیش کیا جاتا ہے :۔

پلا دے ساغرِ پر زور ساقیا جلدی — وہ مے کہ جس میں ہو نصرت کی بو پلا جلدی
بس اب صراحی و ساغر اٹھا کے لا جلدی — شروع جنگ ہے چھلکا کے جام آ جلدی
زیادہ جوش میں جرأت کا نشہ چڑھتا ہے
وغا کو ساقیٔ کوثر کا لال بڑھتا ہے

ایک بند اور سنتے چلئے :۔

ساقیا۔ ہاں مئے گلفام ملا ہونٹوں سے — ساغرِ نور دلارام ملا ہونٹوں سے
سازگین و فرح انجام ملا ہونٹوں سے — آج لبریز کوئی جام ملا ہونٹوں سے
نشۂ بادۂ اعجاز بیانی بڑھ جائے
ہو زبان صاف طبیعت کی روانی بڑھ جائے

مرثیے کے موضوع میں تنوع ہوتا ہے اس لئے شاعر جو خداداد صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے خزینۂ الفاظ سے ایسے لفظ منتخب کرتا ہے جو موضوع کے لحاظ سے ہم آہنگ ہوں۔ نفیس کو الفاظ پر قدرتِ کاملہ حاصل تھی اور انھوں نے ثابت کر دیا کہ بندشِ الفاظ نگینوں کے جڑنے سے کسی طرح کم نہیں اسی لئے ان کے کلام میں اعجاز بیانی ہے۔

منظر نگاری، سراپا اور رزمیہ شاعری میں نفیس نے پرشکوہ الفاظ استعمال کئے اس لئے ان کے مرثیوں میں مصوری اور واقعہ نگاری کے نہایت عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں۔ رخصت، جذبات نگاری، واقعاتِ شہادت اور بین کے مواقع پر سادہ

---

[1] مطلع، "پھر بادشاہ ملکِ سخن حکمراں ہے آج"، بند ۱۱۱

اور سلیس الفاظ نہایت سلیقے سے استعمال کئے جس کی وجہ سے ان کے کلام میں تاثیر پیدا ہوئی۔
مرثیے کے اجزائے ترکیبی کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے "ساقی نامہ" کے اضافہ سے اپنی جدّت اور اختراع کا ثبوت دیا۔

نفیسؔ کے مرثیوں میں زبان کی شیرینی اور حلاوت بھی ہے اور سادگی اور سلاست بھی۔ لطف زبان بھی ہے اور خوبیٔ بیان بھی۔ انھوں نے بھی انیسؔ کی طرح اردو زبان کو الفاظ کا بے بہا ذخیرہ عطا کیا۔ وہ شاعر بھی تھے اور فنکار بھی "غرض نفیس کا کلام اپنی سلاست روی اور نکتہ آفرینی اور انفرادیت کی بنا پر تاریخ مرثیہ گوئی کی ایک نہایت اہم اور مضبوط کڑی ہے۔ جس سے کوئی بھی نقاد یا تذکرہ نگار بے توجہی نہیں برت سکتا۔ حالات اور ذوق بدل جانے کے بعد وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے"[1]

---

[1] مجتبیٰ حسین، پروفیسر، خاندان انیس کے چند نامور شعرا۔ "ارشاد" یکم محرم الحرام ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۹۶۳ء، ص ۱۹

فارغ کی رزمیہ شاعری

حکیم سید طاہر علی ایک بزرگ تھے جن کے اسلاف "قم" سے ہندوستان آئے پہلے وہ قصبہ زید پور (ضلع بارہ بنکی) میں کچھ عرصے قیام پذیر رہے بعدازاں انھوں نے سیتاپور میں مستقل سکونت اختیار کرلی، ۲۷ جنوری ۱۸۴۲ء کو خداوند تعالیٰ نے ان کو ایک فرزند عطا فرمایا، سید محمد افضل نام رکھا گیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم سیتاپور میں ہوئی جب نو سال کے ہوئے تو وہ اپنے نانا مولوی فضل امام کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے۔

لکھنؤ کا ماحول سید محمد افضل کے لئے بہت سازگار ثابت ہوا ایک طرف ناسخ اور آتش کے ادبی معرکے ہو رہے تھے، دوسری طرف انیس اور دبیر مرثیہ گوئی کے آسمان پر شہاب ثاقب کی طرح چمک دمک دکھا رہے تھے۔ سید محمد افضل میر انیس کی مجلسوں میں شریک ہوئے اور ان کے فن کے گرویدہ ہو گئے۔ میر صاحب کا ایک مرثیہ ان کو مل گیا جس کا مطلع ہے:

جب کربلا میں داخلہ شاہِ دیں ہوا

اسی مرثیہ نے ان کے ذوقِ شعری کو ابھارا اور نکھارا۔

۱۸۵۷ء میں لکھنؤ بھی جنگِ آزادی کی لپیٹ میں آگیا اور جب اس کی حالت دگرگوں ہونے لگی تو سید محمد افضل سیتاپور چلے گئے۔ فارسی اور عربی کتابیں پڑھنی شروع کیں اس زمانے میں وہ غزلیں کہا کرتے تھے اور افضل تخلص کرتے تھے

غزل گوئی میں انھوں نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔

ایک دن سید محمد افضل نے اپنے والد ماجد حکیم صاحب سے کہا:

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں غزل گوئی ترک کر دوں تو مجھے میر انیسؔ کا شاگرد کرا دیجئے"۔ [1]

حکیم صاحب نے اس تجویز پر ٹھنڈے دل سے غور کیا لیکن ان کو موقع و محل کا انتظار تھا۔

۱۸۶۴ء میں سید محمد افضل اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ گئے اور دوبارہ ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ میر انیسؔ سے حکیم صاحب کے دیرینہ تعلقات تھے وہ اپنے بیٹے کو میر صاحب کے دولت کدے پر لے گئے اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی میر صاحب نے محمد افضل کو گلے لگا لیا اور فرمایا:

"یہ میرا لڑکا ہے مجھے جو کچھ آتا ہے انشاء اللہ اسے بدل و جان بتاؤں گا آپ مطمئن رہیئے"۔ [2]

۱۲۸۱ھ میں جب سید محمد افضل کو انیسؔ کی شاگردی کا فخر نصیب ہوا تو انھوں نے فارغؔ تخلص اختیار کیا۔ [3] وہ ہر روز میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے فن مرثیہ خوانی سیکھتے، چھ ماہ کی مسلسل مشق کے بعد میر صاحب کے طرز پر ایک مرثیہ سیکھا اور ان سے اجازت لے کر سیتاپور گئے۔ میر صاحب کا سکھایا ہوا مرثیہ ایک مجلس میں پڑھا جو بہت پسند کیا گیا۔

---

[1] نہال حسین حکیم "حال فارغ" مطبوعہ مرقع عالم پریس ہردوئی، ۱۹۰۲ء، ص ۲۰

[2] نہال حسین حکیم، محولہ بالا، ص ۲۲

[3] "فارغ" سے تاریخ نکلتی ہے، ۱۲۸۱ ہجری مطابق ۱۸۶۴ء

میر صاحب کے ارشاد کے مطابق فارغ نے مرثیہ گوئی بھی شروع کردی۔ وہ اپنے والد صاحب کے پاس بلہرہ چلے گئے وہاں ایک مرثیہ کہنا شروع کیا جس کا پہلا بند حسب ذیل ہے:

میں بلبلِ حدیقۂ بزم انیس ہوں　　پروانۂ سراجِ کلام نفیس ہوں
خلاقِ صد نکاتِ دقیق و سلیس ہوں　　اقلیم تاجدارِ سخن کا رئیس ہوں
حاسد مقر ہوا سخنِ لاجواب کا
آندھی بجھا سکی نہ چراغ آفتاب کا [1]

مرثیہ کہتے وقت فارغ کی جو کیفیت ہوتی تھی حسب ذیل رباعی اس کی ترجمان ہے:

حالت یہ دمِ فکر سخن طاری ہے　　غفلت ہے نہ فارغ کو نہ بیداری ہے
آنکھیں وا ہیں بسانِ چشمِ تصویر　　بیداری ہے خواب، خواب بیداری ہے

۱۸۷۲ء میں فارغ نے پہلا مرثیہ مکمل کیا جس میں ۲۸۸ بند ہیں اور بلہرہ سے میر صاحب کی خدمت میں بغرض اصلاح لکھنؤ بھیجا۔ میر صاحب نے تحریر فرمایا کہ اصلاح ان کی موجودگی میں کی جائے گی۔ تعمیل ارشاد کے لئے فارغ لکھنؤ گئے میر صاحب نے اس مرثیہ پر بہ طیب خاطر اصلاح فرمائی آخری بند میں اسی طرف اشارہ ہے

مضموں بہت نفیس ہیں بندش سلیس ہے
حقا کہ سب یہ فیض کلام انیس ہے [2]

فارغ نے دوسرا مرثیہ کہنا شروع کیا تھا جس کا مطلع ہے"

"دیکھ اے مہ فلک مرے اوج کمال کو"

---

[1] فارغ سیتاپوری، سید محمد افضل "پہلا مرثیہ" مطبوعہ امیر المطابع سیتاپور ۱۹۱۵ء ص ۲
[2] فارغ سیتاپوری محولہ بالا، ص ۹۸

کہ میر صاحب اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ اپنے استاد کی موت کا فارغ پر بہت اثر ہوا دوسرے مرثیہ میں انھوں نے میر صاحب مرحوم کے کمالات کا اعتراف کیا اور اس کا ثواب ان کی روح کو بخشا:

حضرت کے فیضِ عام سے قطرے گہر بنے
پرتو سے ایک لطف کے شمس و قمر بنے
بگڑا مرا بھی کام ہر اک سر بسر بنے
ہر بیت پر بہشت معلیٰ میں گھر بنے
ہے مدح نظم آپ سے راس الرئیس کی
اس کا ثواب نذر ہو روحِ انیس کی [۱]

اگلے بند میں فارغ اپنے غم و یاس کی حالت کا اظہار کرتے ہیں کہ اپنے شفیق استاد کے سایہ سے محروم ہونے کے بعد ان کے دل پر کیا کیفیت گزرتی ہے۔

وہ جب سے اٹھ گئے دلِ فارغ اداس ہے
ہر دم ہجوم درد و غم و رنج و یاس ہے
بس اب کوئی شفیق نہ استاد پاس ہے
لیکن جب آپ کی ہے مدد کیا ہراس ہے
لاکھوں ہی سے لڑے شہِ عالی مقام بھی
یہ معترض ہیں کیا نہ دبے گا غلام بھی [۲]

فارغ راجہ محمد کاظم حسین خان بہادر والی بلہرہ کے ملازم تھے اس لئے ان کا زیادہ تر قیام بلہرہ میں رہتا تھا۔ بمرض سرسام ۱۹ صفر ۱۳۱۸ھ کو ان کا انتقال ہوا اور وہیں کربلا میں دفن کئے گئے۔ مرحوم کے چھوٹے بھائی سید ظہور الحسین صاحب فروغ [۳] نے قطعہ تاریخ لکھا ہے ہر مصرع سے تاریخ وفات عیسوی، فصلی، سمت اور ہجری کے حساب سے نکلتی ہے:

۱۔ فارغ سیتاپوری، ——— دوسرا مرثیہ، بند ۵۲۱ ص ۱۴۲

۲۔ فارغ سیتاپوری، ——— دوسرا مرثیہ، بند ۵۲۲ ص ۱۴۲

۳۔ مولف، "شجرات طیبات" سیتاپور: امیر المطابع، ۱۹۱۸ء، ص ۸۲۸

وائے دردا فارغؔ رنگیں بیان	ازجہاں رفتہ اجل راجان سپرد
۱۹۰۰ء	۱۳۰۷ ف
اے فروغؔ این دور گردوں ہم ببیں	مدح خوان جبان زہرا حیف مرد
۱۹۵۷ سمت	۱۳۱۸ھ

فارغؔ کے چھ طویل مراثی[۱] ہیں گیارہ سلام اور بائیس رباعیاں:

نمبر شمار	مطلع	موضوع	تعداد بند	سنہ تصنیف
۱	میں بلبلِ حدیقۂ بزمِ انیسؔ ہوں	حضرت علی اکبرؑ	۳۴۸	۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء
۲	دیکھ لے مہ فلک مرے اوج کمال کو	حضرت امام حسینؑ	۶۶۹	۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء
۳	تجدِ مظہرِ اسرارِ خدا ہیں احمدؐ	حضرت علی اکبرؑ	۲۵۳	۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء
۴	میں داورِ معنی ہوں خداوند سخن ہوں	عبداللہ بن حسنؑ	۳۹۲	۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ء
۵	ریاضِ دہر ہرا کن کے فیض عام سے ہے	ہجرت رسول خداؐ	۱۰۷	۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء
۶	شوکت نمائے فوجِ سخن ہے علم مرا	حضرت عباسؑ	۸۲۵ (نا مکمل)	۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء

میر انیسؔ نے ایک ہی مرثیہ کی اصلاح کے وقت فارغؔ کو مرثیہ کے تمام اسرار و رموز سے روشناس کرا دیا تھا اور میر صاحب کی فیض صحبت اور اپنی طبع کی جودت کی وجہ سے وہ ایک کامیاب مرثیہ گو اور مرثیہ خواں گزرے ہیں۔ ان کی شاعری کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ”فارغؔ کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی

۱؎ فارغؔ سیتاپوری ”کوکبۂ فارغؔ“ سیتاپور، امیر المطابع، ناشر سید محمد حیدر ندیمؔ ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء

رزمیہ شاعری ہے۔" ؎۱

ادب کی تاریخ میں رزمیہ شاعری کا مقام نہایت بلند ہے اور ہر ملک اپنی زبان کی رزمیہ شاعری پر فخر سے سر بلند کر سکتا ہے۔

رزمیہ شاعری

"رزمیہ شاعری جس کو انگریزی میں ایپک پوئم کہتے ہیں شاعری کے انواع میں سے بہترین نوع ہے۔ یورپ کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہومر ہے اس کا کارنامۂ فخر یہی رزمیہ شاعری ہے۔ مہابھارت جس کو ہندو آسمانی کتاب سمجھتے ہیں وہ بھی ایک رزمیہ نظم ہے" ؎۲

کامیاب رزمیہ شاعر کی اہلیت کے بارے میں اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ "جب تک کسی شاعر کے دل میں دلولہ اور جوش نہ ہو وہ فاقہ کرنے کو کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بہتر نہ سمجھتا ہو ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح نہ دیتا ہو اس وقت تک وہ رزم گوئی میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔" ؎۳

"ایپک کی خصوصیات کا ماحصل یہ ہے:۔

(۱) ایک نظم ہو جس میں کہانی موجود ہو۔

(۲) یہ کہانی ایسی ہو جس کا مواد انسانی تجربے سے بڑا قریبی تعلق رکھتا ہو۔

(۳) اس کہانی میں جو عمل موجود ہو وہ مہتم بالشان ہو، واحد ہو اور مکمل ہو۔

؎۱ صفدر آہ "فردوسی ہند" بمبئی، قادری پریس، نور منزل، ناشر کتاب کدہ وائیکلیشور روڈ، ۱۹۵۸ء، ص ۱۰۸

؎۲ شبلی نعمانی، مولانا "شعر العجم" لاہور، رشید آرٹ پریس، ناشر ملک نذیر احمد پروپرائٹر تاج بک ڈپو، جلد اول۔ ص ۱۲۰

؎۳ مسعود حسن رضوی، پروفیسر "روح انیس" الہ آباد انڈین پریس لمیٹڈ ص ۲۸ - ۲۷

(۴) شاعر مواد زندگی سے اخذ کرے اور اس سلسلے میں اپنے تصورِ حیات اپنے عقیدے یعنی اپنی ذاتی اقدارِ مطلق سے کام لے، اور

(۵) اس کی زبان سلیس بھی ہو اور پُر شکوہ بھی۔" ؎۱

ایپک کی مختصر تاریخ:

پہلی ایپک ہومر کی ایلیڈ (ILIAD) اور اوڈیسی (ODYSSEY) ہیں جن کا سنہ تصنیف تقریباً سات سو (۷۰۰) سال قبل مسیح ہے۔ ہومر کی تقلید میں رزمیہ شاعری کا رواج ہوا اور دوسری زبانوں میں ایپک لکھی گئیں مثلاً لاطینی، ورجل کی اینڈ۔ (VIRGIL'S AENEID) تیس سال قبل مسیح لکھی گئی۔ فرانسیسی (CHANSON DE ROLL-AND) گیارہویں صدی کے آخر میں یہ ایپک تصنیف کی گئی۔ پرتگالی (THE LUCIDAS) ۱۵۷۲ء میں لکھی گئی۔ اطالوی تاسو (TASSO) کی تصنیف (JERUSALEM DELIVERED) ہے۔ انگریزی (BEOWULF) چھٹی یا ساتویں صدی میں لکھی گئی۔

"جتنی ایپک نظمیں ہیں اور جس قوم سے متعلق ہوں وہ بالعموم وہاں کے دیوتاؤں یا بلند مرتبت قومی سورماؤں کے کارنامے (DEEDS OF HEROES) ہیں اور ان سب میں مافوق الفطرت اور حیرت انگیز عناصر بھی کم و بیش پائے جاتے ہیں نیز ان افسانوں یا اساطیر کو مذہبی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔" ؎۲

ایپک شاعری کی جو خصوصیات بیان کی گئیں فارغ مرحوم کی شاعری ان تمام محاسن کی حامل ہے۔ اور اس کا ہیرو وہ ہے جس کی عظمت کو صرف مسلمانانِ عالم ہی

؎۱ سجاد رضوی "مرثیہ اور ایپک" سہ ماہی صحیفہ لاہور جون ۱۹۵۸ء شمارہ ۵ ص ۶۶

؎۲ اثر لکھنوی، مرزا جعفر علی خان "انیس کی مرثیہ نگاری اور ان پر چند اعتراضات کا جواب" لکھنؤ، مطبع ادبی پریس، ناشر۔ دانش محل، مارچ ۱۹۵۱ء، طبع اول، ص ۳۰

نے تسلیم نہیں کیا بلکہ دوسرے مذاہب کے افراد بھی اس کے بلند کردار کے گرویدہ ہیں اور اس کی قربانیوں کے معترف ہیں اس ضمن حضرت جوش کی زندہ جاوید رباعی پیش کی جاتی ہے

کیا صرف مسلمان کے پیارے ہیں حسینؑ چرخ نوع بشر کے تارے ہیں حسینؑ
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو! ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

ایپک شاعری کی چند خصوصیات اور بھی ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے ایپک شاعری میں ڈرامائی انداز بہت ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایپک ڈرامہ نہیں ہے لیکن اسے ڈرامائی خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے تاکہ دیگر اصناف شاعری کے مقابلے میں وہ زیادہ موثر، دل کش اور دلآویز ثابت ہو۔

مورخ حقائق کی روشنی میں واقعات کو بیان کرتا ہے اور ان کی تفصیلات کا بھی جائزہ لیتا ہے لیکن رزمیہ شاعر ایسی باتیں نظم کرتا ہے جن کے واقع ہونے کا امکان پایا جاتا ہے جو مورخ کی رسائی سے بالاتر ہیں۔

ایپک کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کو پڑھ کر سالمیت کا احساس ہو یعنی اس کا آغاز ہو وسط اور اختتام بھی۔ تشنگی باقی نہ رہ جائے ایپک میں مختلف واقعات نظم کئے جاتے ہیں لیکن ان میں تسلسل اور ہم آہنگی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ایپک، کو سبق آموز ہونا چاہیئے اس میں اخلاقی درس بھی سمو دیا گیا ہو اور نیک اعمال کی تلقین بھی ہو تاکہ اس پر بقائے دوام کی مہر ثبت ہو سکے۔

رزمیہ شاعری کے ایسے بھی نمونے ہیں جو ہومر کی تقلید سے مستغنی ہیں مثلاً مہابھارت اور رامائن جن کا سنہ تصنیف تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح ہے اور فردوسی کا شاہنامہ جو ۴۰۰ ہجری مطابق ۱۰۰۹ء میں اختتام پذیر ہوا۔

رزمیہ شاعری واقعہ نگاری ہی کی ایک قسم ہے مرثیہ میں میر ضمیر نے اس کی ابتدا کی وہ نقش اولین تھا۔ میر انیس نے اس صنف میں کمال حاصل کیا۔ فارغ

نے میر صاحب مرحوم سے استفادہ کیا ان کے مرثیے بھی رزمیہ شاعری کی تمام خصوصیات کے حامل ہیں۔

واقعہ نگاری:

رزمیہ شاعری جوش و ولولہ انگیز بھی ہوتی ہے اور حقیقت آشنا بھی۔ ۲/ محرم الحرام ۶۱ ہجری کو یزیدی فوج کا ایک دستہ نہایت آن بان سے کربلا میں وارد ہوتا ہے فارغ نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا کہ دشتِ کربلا میں باجوں کی صدائیں گھوڑوں کے قدم قدم پر ہنہنانے اور ٹاپوں کی صدائیں سنائی دینے لگتی ہیں:

ناگاہ آئی دور کے باجوں کی کچھ صدا — پیدا ہوئی سیاہی لشکر بھی جا بجا
بھرّایا بارِ فوج سے صحرائے کربلا — گیتی کا زلزلہ ہوا محسوس زیرِ پا
ظلمت سیہ نشانوں کی آگے بڑھی ہوئی
اک رات تھی کہ آئی تھی دن پر چڑھی ہوئی [1]

رفقائے شاہ کو جب معلوم ہوا کہ یہ شام کے لشکر کے نشان ہیں تو آپس میں وہ کہنے لگے کہ ہم ٹھہرے جناب امیرؑ کے غلام بھلا یہ لشکر ہماری نگاہ میں کیا سما سکتا ہے حضرت عباسؑ نے جوشِ شجاعت کے سخن سن سن کر ان کو مرحبا کہا اور فرمایا:

اس طرح خاک میں صفِ افواجِ شر ملے — پیچھے جو رہ گئے ہوں نہ ان کو خبر ملے

یہ ذکر تھا کہ بھر گیا میدان سپاہ سے — صحرا تمام ہو گیا پنہاں نگاہ سے
نعرے کیے جو بڑھ کے شریروں نے راہ سے — بھاگا لرز کے امن۔ مقامِ پناہ سے

---

[1] فارغ سیتاپوری، "چھٹا مرثیہ" امیر المطابع سیتاپور بند ۸۸، ص ۲۳

دوڑے فرس کہ آگئی آفت جہان پر [1]

اڑ کر چلا زمین کا طبق آسمان پر [2]

بیت کتنی عمدہ ہے ممکن ہے یہ مضمون فردوسی کے شاہنامہ کا رہین منت ہو رزمیہ شاعری میں اعتقاد کی ترجمانی بھی ہوتی ہے اس ضمن میں فارغ کے مرثیہ سے ایک بند نقل کیا جاتا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کربلائے معلی پہنچے ہیں نہر فرات کے قریب خیام اہلبیت کا انتظام کیا جاتا ہے اس حالت کی عکاسی شاعر اپنے خصوصی انداز میں کرتا ہے۔

نوبت بجی سلامی شاہ غیور کی ! پہنچی مقام پر جو سواری حضور کی

پاس آگئی سمٹ کے زمین دور دور کی مشتاق تھی جو کہ قدم کے ظہور کی

دامن بڑھا دیا تو گل مدعا ملے

نزدیک تھا کہ اُٹھ کے رکابوں سے جا ملے [3]

انداز بیان کس قدر دل کش ہے زمین کا سمٹ کر پاس آجانا بظاہر مبالغہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب دماغ میں یہ خیال ہو کہ رسول اکرم (صلعم) کے نواسے حضرت علیؑ کے نور عین بی بی فاطمہ کے لخت جگر کلمۂ حق کی تبلیغ کے لئے اس ارض پاک پر تشریف لائے تو یہ مبالغہ آرائی نہ رہے گی امام مبین (علیہ السلام) تو خشک و تر کا مالک ہوتا ہے "وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ" [4] کے پیش نظر

---

[1] فارغ سیتاپوری "چھٹا مرثیہ" ـــــ، بند ۹۳، ص ۲۵۔ [2] فردوسی کے شاہنامہ کا بھی ایک شعر سنتے چلئے:

زبس گرد میدان کہ پر شد بہ دشت زمین شش شد و آسمان گشت ہشت

یا

ز سم ستوران بہنائے دشت زمین شش شد و آسمان گشت ہشت

(معرکہ کارزار گرم ہے گھوڑوں کے ٹاپوں سے دشت میں اس قدر گرد و غبار اڑا کہ زمین کا ایک طبقہ آسمان تک پہنچ گیا زمین کے سات طبقے ہیں اور آسمان کے سات طبقے لیکن زمین کا ایک طبقہ آسمان سے جا ملا چھ طبقے زمین کے رہ گئے اور آسمان کے آٹھ طبقے ہو گئے)

[3] فارغ سیتاپوری "چھٹا مرثیہ" ـــــ بند ۱۴، ص ۱۳۔ [4] سورۂ یٰسین، پارہ بائیس و تئیس (۲۳-۲۲) ترجمہ: (خدائے بزرگ و برتر فرماتا ہے کہ ہم نے امام مبین میں ہر چیز کا احصا کر دیا اور ساری کائنات اس کے زیر نگین ہے۔

مبالغہ حقیقت سے بدل جاتا ہے۔

جذبات نگاری :

جذبات نگاری کو بھی رزمیہ شاعری سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ فارغ نے جذبات نگاری میں ماہر نفسیات کے فرائض انجام دیئے۔ کربلائے معلی پہنچتے ہی حضرت سکینہ پر پیاس کی شدت سے غشی کی کیفیت طاری ہو گئی حضرت عباس اپنی لاڈلی بھتیجی کے لئے پانی لاتے ہیں اور کہتے ہیں :۔

"لو جام آب کہدو کہ عباسؑ لائے ہیں"

اس کے بعد فارغ کی زبانی سنئے :

عمو کا نام سن کے وہ چونکی تو دی صدا — جلدی اٹھاؤ مجھ کو کدھر ہیں مرے چچا
پردے میں گھٹ گئی ہوں ہیں باہر کی دو ہوا — کیوں میری پیاری کہہ کے بلاتے نہیں یہ کیا
کڑھتی ہوں کب تلک نہ گلے سے لگائیں گے
پانی پیوں گی جب مجھے عمو پلائیں گے ؎۱

پردے میں گھٹ گئی باہر کی ہوا دی جائے تو جان میں جان آئے گی چچا جان سے شکوہ ہے کہ "میری پیاری کہہ کے" کیوں نہیں بلاتے۔ اپنے عمو ہی کے ہاتھ سے پانی پیوں گی بھتیجی کی اپنے پیارے چچا سے ضد کس قدر فطری ہے۔

جذبات نگاری کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔

جب امام عالی مقام کربلائے معلی پہنچے تو آپ کی ہمشیرہ حضرت زینب نے یہ تجویز پیش کی کہ کچھ عرصے یہیں قیام کیا جائے کیونکہ گرمی کے دنوں میں سفر میں بڑی تکلیف ہوتی ہے اور پانی کا انتظام بھی بہت ضروری ہے اس لئے کسی ایسے شخص کو مہتمم آب

؎۱ فارغ سیتاپوری، "چھٹا مرثیہ" بند ۶۵ ص ۱۸

مقرر کر دیا جائے جو تلوار کا دھنی ہو اور بہادر ہو۔ امام حسین پر ان باتوں کا کیا اثر ہوا یہ فارغ کی زبان سے سنیئے:

سن کر بہن کی باتوں کو تا دیر روئے شاہ
فرمایا دشمنوں نے نکالا وطن سے آہ
گھر میں خدا کے بھی نہ مسافر کو دی پناہ
منظور ہے انھیں کہ ہوں بچے مرے تباہ
دنیا بھری ہوئی ہے نہ کب تک بکا کروں
زینب تمہیں بتاؤ کدھر جاؤں کیا کروں [۱]

ایک بند میں شاعر نے تاریخی واقعات کو نظم کے سانچے میں ڈھال کر اپنی فنکاری کا ثبوت دیا "دنیا بھری ہوئی ہے" کے مختصر سے ٹکڑے میں انقلاب زمانہ کی روداد بیان کر دی۔ ہر قریہ میں اعدائے دین، خون کے پیاسے ہیں شہر کے چاروں طرف ناکہ بندی ہے۔ اس لئے یہاں سے کہیں جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ "کیا کروں میں" بے کسی اور بے بسی کی داستان مضمر ہے۔

جذبات نگاری کی ایک اور مثال پیش کی جاتی ہے۔ اٹھارہ سال کا کڑیل جوان اپنے ضعیف باپ کے سامنے دم توڑتا ہے یہ ایسا دل خراش منظر ہے کہ اگر دشمن بھی دیکھے تو اس کا کلیجہ بھی نکل پڑے۔ حضرت علی اکبر برچھی کھا کر امام عالی مقام کو آواز دیتے ہیں آپ لاش علی اکبر پر افتاں و خیزاں پہنچتے ہیں اس وقت کی کیفیت فارغ کی زبان سے سنیئے

صابر بھتے گرچہ بادشہ آسماں جناب
لیکن یہ وہ جگہ تھی کہ باقی رہی نہ تاب
بھڑکی جگر میں آگ تو دل ہو گیا کباب
تھرائے دم الٹ گیا تڑپے بہ اضطراب
نالے کئے کبھی۔ کبھی خاموش ہو گئے
گر گر اُٹھے تڑپ گئے بے ہوش ہو گئے [۲]

---

[۱] فارغ سیتا پوری "چھٹا مرثیہ" ــــــ، بند ۷۳ - ص ۲۰

[۲] " " "پہلا مرثیہ" بند ۳۶۲، ص ۹۲ -

بیت پڑھتے ہی کربلا کا وہ روح فرسا منظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ کس قدر کامیاب عکاسی اور مرقع کشی ہے۔ مختصر الفاظ میں ایسے مفہوم کو ایک قادر الکلام شاعر اور نفسیات کا ماہر ہی ادا کر سکتا ہے۔ سلیس اور سادہ الفاظ میں درد و کرب کی ایک دنیا ہے جو کروٹیں لے رہی ہے۔ اسی ضمن میں ایک اور بند نقل کیا جاتا ہے جس سے امام حسین علیہ السلام کی ذہنی کیفیات کا مزید جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

کہتے تھے دل پکڑ کے یہ سلطانِ مشرقین
بیٹا اٹھو کہ اٹھ گیا بابا کے دل کا چین
سر پیٹے، تم کو تھامے کہو کیا کرے حسین
ڈیوڑھی پہ وہاں کھڑی ہوئی ماں کر رہی ہے بین
تم کو طلب کرے جو حسین غریب سے
بتلاؤ کیا کہوں میں اس آفت نصیب سے ۱؎

سلطان مشرقین کی ادھر یہ حالت ہے دوسری طرف اس سانحہ کا حضرت زینب پر جو اثر ہوا وہ فارغ کی زبان سے سنیئے:

چلاتی تھی ارے مرا پالا ہے کس طرف
بتلاؤ جانِ سید والا ہے کس طرف
میرے اندھیرے گھر کا اجالا ہے کس طرف
ہے ہے وہ لمبے گیسوؤں والا ہے کس طرف
مر جاؤں جا کے اس کے تن پاش پاش پر
پہنچا دے اے اجل مجھے اکبر کی لاش پر ۲؎

حضرت زینب نے حضرت علی اکبر کو پالا تھا۔ ایک پالنے والی کے جذبات کی کس قدر صحیح تصویر کشی ہے سلاست کے باوجود ہر لفظ سے غم و اندوہ کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ تمنا کس قدر فطری ہے "پہنچا دے اے اجل مجھے اکبر کی لاش پر" اسی قسم

۱؎ فارغ سیتاپوری "پہلا مرثیہ" بند ۳۶۴، ص ۹۲

۲؎ " " " " ۳۷۱، ص ۹۴۔

کے اور بھی بہت سے نمونے فارغ کے مرثیوں میں ملیں گے۔

کردار نگاری:

رزمیہ شاعری میں کردار، عظیم، عہد آفرین اور مثالی ہونے چاہئیں امام حسینؑ کا مختصر لشکر بہتر (۷۲)، مجاہدین پر مشتمل تھا جس میں حضرت حبیب بن مظاہر جیسے معمر و مُسِن بھی تھے اور حضرت علی اصغر جیسے کم سن بھی۔ امام حسینؑ کا خیر کہنا ہی کیا۔ رسول صلعم اکرم کے نواسے حضرت علی کے نورِ نظر اور بی بی فاطمہ کے لختِ جگر تھے۔ حضرت عباس امام حسین علیہ السلام کے وفادار بھائی اور حسینی لشکر کے علمبردار تھے۔ حضرت علی اکبر کا عنفوانِ شباب تھا وہ شجاعت کے پیکر تھے۔ حضرت قاسم امام حسینؑ کے بھتیجے اور داماد تھے حضرت عون و محمد بی بی زینب کے لاڈلے بیٹے تھے غرض اٹھارہ جوانانِ ہاشم کا ایک گلدستہ تھا باقی امام حسین علیہ السلام کے انصار تھے حسینی فوج کے ہر ایک ہیرو کا کردار قابل فخر بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔ فارغ کے مختلف مرثیوں سے نہایت اختصار کے ساتھ کردار نگاری کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں:

امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ کربلا کی سرزمین پر زمانہ سلف کے ہادی اور پیغمبر تشریف لائے اور سب کا یہیں بلاؤں میں امتحان ہوا۔

یہ کربلا ہے ہر "سعید" کی جگہ اور رب مجید کی محبت کا معیار۔

جویا اسی کے ہم بھی تھے آج آئے ہیں ادھر — انجام جو ہو اس کی توجہ پہ ہے نظر
ہر گام پر ہیں راہِ محبت میں سو خطر — ہوتی ہے دیکھیں اپنی مہم کس طرح سے سر
عاشق وہی ہے جو تہہ خنجر گلو رکھے
ہو وقتِ امتحان تو خدا آبرو رکھے [۱]

---

[۱] فارغ سیتاپوری، "چھٹا مرثیہ" بند ۵۵ ص ۱۵

عشقِ الٰہی کی کتنی صحیح تعریف ہے ایسے عاشق کی زندگی کا مقصد ہے رِضاً بِقضائِہٖ وَتَسلِیماً لِاَمرِہٖ جو اس پر عمل پیرا ہو یقیناً اس کا کردار "مثالی" اور "عہد آفرین" ہوگا۔

امام حسین علیہ السلام کے کردار کی متضاد خصوصیات فارغ نے کس سلیقے سے پیش کی ہیں :

دعویٰ جلال کا ہے کہ بیٹے علی کے ہیں
رحمت پکارتی ہے نواسے نبیؐ کے ہیں

نبیؐ کے نواسے ہیں اس لئے "ہنگام ذبح لب نہ ہلیں گے بجز دعا"
شمر مکر و زور کی باتیں کرتا ہوا بارگاہ حسینی میں باریاب ہوتا ہے امامؑ سب کچھ جانتے ہوئے بھی حضرت عباس سے فرماتے ہیں :

عباس جاؤ گو کہ یہ پر مکر و زور ہے
دشمن بھی گھر میں آئے تو خاطر ضرور ہے [۱]

حضرت عباس کے کردار کی ایک جھلک ملاحظہ فرمایئے ان کی دعا ہے کہ ولائے آلِ محمدؐ میں ثابت قدم رہیں اور جسم سے سر جدا ہونے کے بعد بھی شاہِ امم کی طرف رخ رہے ان کی تمنا ہے کہ :

لٹ جائیں گھر تباہ ہوں برباد ہوں عیال — آنکھوں سے دیکھیں مٹتے ہوئے سب متاع و مال
تیغوں سے پرزے پرزے ہوں لاشہ ہو پائمال — چھوٹے مگر نہ دامنِ سلطانِ خوشخصال
مر کر بھی ابنِ شاہ ولایت کے ساتھ ہوں
اٹھیں جو حشر میں بھی تو حضرت کے ساتھ ہوں [۲]

---

[۱] امام حسین کے پیش نظر رسول پاکؐ کی وہ حدیث ضرور رہی "اَکرِمُوا الضَّیفَ وَلَو کَانَ کَافِراً" (مہمان کی تواضع کرو خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو)

[۲] فارغ سیتاپوری "چھٹا مرثیہ" بند ۱ ۶ ص ۱۷

حضرت عباس پیکر وفا تھے۔ وہ قوتِ بازوئے امام حسین تھے لیکن ہمیشہ اپنے آپ کو ان کا غلام کہا کرتے تھے۔ وہ اشجع عرب تھے۔ علمبردار لشکرِ حسین بھی تھے اور سقائے اہل بیت بھی۔ امام حسین سے آپ کو بے پناہ محبت تھی اور عقیدت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے جام شہادت نوش فرمایا تو امامؑ نے فرمایا "قَدْ اِنْکَسَرَتْ ظَھْرِی (عباس) تمہارے مرنے سے میری کمر ٹوٹ گئی۔

فارغؔ نے خوب کہا ہے:

شیرِ خدا کے شیر ہیں عباسِ نامدار　　　لاکھوں میں اک دلیر ہیں عباس نامدار

حضرت عباس کی شہادت کے بعد بھی حضرت علی اکبر کو رن کی اجازت نہیں ملتی اور امام حسینؑ جام شہادت نوش کرنے کے لئے بے قرار ہیں اس وقت حضرت علی اکبر فرماتے ہیں:

اچھا یہی ہے عزم جو اے شاہِ نامدار　　　پہلے خدا کی راہ میں کیجئے مجھے نثار
حضرت اُدھر بڑھے طرفِ دشتِ کارزار　　　یاں مر گیا زمیں پہ تڑپ کر یہ خاکسار
تب قصد کیجئے سپہ روم و شام کا
سر پہلے کاٹ ڈالیے اپنے غلام کا[۱]

کیوں کر حضور ہوں گے ابھی عازمِ وغا　　　مولا نکل نہ جائے گا دم اس غلام کا
بیٹا جو ایسے وقت میں کردے نہ سر فدا　　　دشمن وہ باپ کا ہے نہ بخشے اسے خدا
میں اور مدد کروں نہ امام غیور کی
حاشا نہ ہو سکے گا، دوہائی حضور کی[۲]

۱؎ فارغ سیتاپوری، "پہلا مرثیہ" بند ۹۱، ص ۲۴

۲؎ " " " بند ۹۲، ص ۲۴

فرق مراتب کا کس قدر خیال رکھا گیا سادہ الفاظ میں خلوص، کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے حضرت علی اکبرؑ اپنے والد ماجد کو حضور کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ امام وقت جو ہوئے، آڑے وقت میں امام پر جان دینا ہی تو عین ایمان ہے۔ بھلا وہ اس سعادت سے کیسے محروم رہ سکتے تھے، بیٹے کا فرض ہے کہ ایسے وقت میں باپ کی مدد کرے محبت کا بھی تو آخر کچھ تقاضا ہوتا ہے۔

شب عاشور، جب امام حسین اپنے رفقاء اور اعزہ کی گردنوں سے بیعت اٹھا لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جس شخص کا جہاں جی چاہے چلا جائے۔ اس وقت امام حسینؑ کے اعزہ اور رفقاء اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہیں۔ حضرت مسلم بن عوسجہ ایک بزرگ صحابی تھے ذرا ان کے کردار کی جھلک ملاحظہ ہو۔

یا سرورِ زماں قسم ربِ انس و جاں   چھوڑوں گا میں نہ آپ کو جب تک ہے تن میں جاں
جو ولولے ہیں کیوں ابھی منہ سے کریں بیاں   وقت ان کا معرکہ میں ہے کل وقتِ امتحاں
کانپے گا رن مچیں گی وہ دھومیں ستیز کی
برسوں ہوا سے آئے گی بو تیغ تیز کی [1]

مختلف اسلحہ بدن پر سجا کر اعدائے دین سے اس وقت تک جنگ کروں گا جب تک تمام حربے بے کار نہ ہو جائیں اور حضور پر صدقے ہو جانے کے بعد۔

بالفرض بعد قتل یہ کفار جنگ جو!   لاشہ جلا کے خاک اڑا دیں ہر ایک سو
قدرت سے پھر میں زندہ ہوں یا شاہ نیک خو   ہفتاد واقعے یونہیں آئیں جو روبرو
پھر بھی یہی ہو دھن یہی دل میں امنگ ہو
پھر میں ہوں پھر یہ تیغ ہو پھر دشتِ جنگ ہو [2]

---

[1] فارغ سیتاپوری۔ "دوسرا مرثیہ" بند ۸۱، ص ۲۲

[2] " " " " " ۸۴ ص ۲۲

بعدازاں

بولے حبیب بڑھ کے کہ یا شاہِ نامدار
خادم بھی یوں ہی مر کے جیے گر ہزار بار
واللہ پھر بھی آپ کے قدموں پہ ہوں نثار
کہتے ہیں جو وہ کر کے دکھا دیں یہ خاکسار
دس پر نہ بند ہوں گے نہ سو کی قطار پر[۱]
بھاری ہے ایک ایک کا مردہ ہزار پر

بخوف طوالت اور نمونے نہیں پیش کئے جائیں گے صرف ایک بند سن لیجیے جس سے معلوم ہو جائیگا کہ انصارانِ حسین کیسے بلند کردار کے مالک تھے:

جھرمٹ مصاحبوں کا جو سرور کے ساتھ ہے
مجمع صحابیوں کا پیمبرؐ کے ساتھ ہے
ایک ایک باخدا ہے جو لشکر کے ساتھ ہے
امت نبیؐ کی شافعِ محشر کے ساتھ ہے
قدسی اِدھر اُدھر ہیں شہِ مشرقین کے
ہیں سب کے ہاتھ دامنِ زینِ حسین پر، [۲]

ایسے رفقار کائنات میں بھلا کس کو نصیب ہوئے جن میں سے ہر ایک باخدا تھا، بندے کی اس سے زیادہ اور کیا رسائی ہو سکتی ہے کہ وہ "باخدا" ہو جائے دنیائے شاعری کیا ایسے مثالی کردار پیش کر سکتی ہے۔

سراپا:

مرثیہ کی رزمیہ شاعری میں سراپا نہایت اہم موضوع ہے پرشکوہ الفاظ کے علاوہ نادر تشبیہات اور پھر فرقِ مراتب کا لحاظ رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ فارغؔ نے حضرت علی اکبرؑ کا سراپا کئی مرثیوں میں نظم کیا ہے نمونہ کے طور پر

---

[۱] فارغ سیتاپوری "دوسرا مرثیہ" بند ۸۶، ص ۲۳

[۲] " " "چھٹا مرثیہ" بند ۴۴، ص ۱۲

چند بند پیش کئے جاتے ہیں:

وہ سبک خیزیِ رہوار وہ اسوار کی شان
رُخ پہ لہرانے ہیں وہ کاکلِ طرار کی شان
ضو وہ پیشانی کی وہ روئے ضیا بار کی شان
ساری شانوں سے جدا حیدرِ کرار کی شان
بل ہیں ابرو پہ تو گیسو ہیں معنبر دونوں،
ایک پیکر میں ہیں یاں احمدؐ و حیدر دونوں [1]

چھٹے مصرع میں شاعر نے مختصر طریقے سے کہہ دیا کہ حضرت علیؑ اکبر شبیہہ رسولؐ بھی ہیں اور حضرت علی کی شجاعت کے ورثہ دار بھی، کس قدر جامع مصرع ہے اس مفہوم کو شاید ہی کسی شاعر نے اس طرح ادا کیا ہو۔

اسی مرثیہ میں حضرت علی اکبر کی زلفوں کی یوں تعریف کی گئی۔

زلف کو سلسلۂ حلِ مہمات کہوں
یا اسے سنبلِ بستانِ طلسمات کہوں
نکلے الجھی ہوئی جو منہ سے وہ کیا بات کہوں
شب کہوں، شام کہوں، عالم ظلمات کہوں
گھر ہے یاں رات کا دن ہونے کی امید نہیں
رُخ کا وہ رخ ہے ادھر پرتو خورشید نہیں [2]

فارغ نے جولانی طبع کے جوہر دکھائے نادر تشبیہات سے کلام میں کس قدر لطف پیدا کر دیا۔ سیاہ زلف کی تشبیہہ عالم ظلمات سے دینے سے اس کا قائل ہونا پڑتا ہے:

'ہے پرِ مرغِ تصور کی رسائی تا کجا'

حضرت علی اکبرؑ کے رخِ تاباں کے لئے فارغ نے کہاں کہاں سے تشبیہیں

---

[1] فارغ سیتاپوری "تیسرا مرثیہ" بند ۸۲ ص ۲۲

[2] " " " " بند ۹۲ ص ۲۴

تلاش کی ہیں :

پرتوِ رُخ کو جو کہتے ہیں سحر کا جلوہ ! شاید آنکھوں میں نہ ہو ان کی نظر کا جلوہ
ان پہ روشن ہے یہ جلوہ ہے بشر کا جلوہ جلوۂ طور ہے اس رشکِ قمر کا جلوہ

چاندنی لے کے عجب نور کا روپ آئی ہے
دھوپ پر دھوپ ہے یا چھاؤں پہ دھوپ آئی ہے [۱]

"دھوپ پر دھوپ ہے یا چھاؤں پہ دھوپ آئی ہے" کس قدر حسین مصرع ہے تعریف توصیف سے مستغنی۔

ایک اور مرثیہ میں حضرت علی اکبرؑ کا سراپا فارغ نے اس طرح نظم کیا ہے:

اللہ رے حسنِ اکبرؑ عالی جناب کا گر گر گیا نظر سے جمال آفتاب کا
عالم تو دیکھیو رُخِ پر آب و تاب کا نقشہ کھنچا ہوا ہے نبیؐ کے شباب کا

غل تھا گئے تھے شیب میں دنیائے زشت سے
احمدؐ جوان ہو کے پھر آئے بہشت سے [۲]

حضرت علی اکبرؑ ہم شبیہِ پیغمبر تھے بھلا آفتاب کیسے ان کا مدمقابل ہو سکتا تھا۔ چوتھا مصرع کس قدر بلیغ ہے۔ رسول اکرمؐ کی زیارت نہ کی ہو تو حضرت علی اکبرؑ کو دیکھ لیجئے ان کو دیکھ کر رسول پاک کا عالم شباب یاد آجاتا ہے۔

فوج مقابل کا ایک پہلوان بکر بن غانم جو حضرت علی اکبرؑ سے معرکہ آرا ہوتا ہے خوفناک کوہ پیکر عفریت ہے فارغ نے اس دیو پیکر انسان کی ظاہری صورت کے ساتھ ساتھ اس کی نفسیات بھی اجاگر کر دی ہیں۔

---

[۱] فارغ سیتاپوری "تیسرا مرثیہ" بند ۹۵، ص ۲۵
[۲] " " " "پہلا مرثیہ" بند ۲۷، ص ۸

سب کے آگے ہوئی شکل کا ایک دیو مہیب کوہ تن، ازحش کی بھی صورت و ہیئت ہی عجیب
تند و پر شور، شرارت میں شیاطین کا ادیب موت بھی آئے تو ڈرتی ہوئی سرکش کے قریب
مڑ کے تکتا ہے تو سب فوج لعیں دبتی ہے
تن کا لنگر ہے کہ سائے سے زمیں دبتی ہے [1]

طولِ قامت کو نہ دیکھے سے رہے تاب شکیب پاؤں ٹک جائیں زمیں پر جو نہ روکے ہو رکیب
وہ فرس اور وہ تنِ ظالم پر مکر و فریب قد بڑھائے ہوئے بیٹھا ہے شجر پر آسیب
لاکھ اڑے گردِ قدم خاک نہ سر تک پہنچے
اڑ کے پہنچے جو بگولا تو کمر تک پہنچے [2]

فارغ نے دیو مہیب کی مناسبت سے ایسی صفات اور تراکیب اور تشبیہات استعمال کیں جن سے اس کی ہیئت کا نقشہ قارئین کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے "قد بڑھائے ہوئے بیٹھا ہے شجر پر آسیب" کس قدر بلیغ مصرع ہے۔ مشہور ہے کہ پرانے درختوں پر آسیب ہوتا ہے۔ لیکن قد بڑھائے ہوئے، کے ٹکڑے نے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

حضرت حبیب بن مظاہر امام حسین علیہ السلام کے ایک سن رسیدہ رفیق ہیں۔ شوقِ شہادت ان کو بے چین کئے ہوئے ہے وہ دشمن سے جنگ کے لئے تیار ہوتے ہیں فارغ کی فن کاری ملاحظہ ہو:

ہاتھوں سے یوں چڑھائے وہ ابروئے بے مثال پٹی جبیں پہ کھینچ کے باندھی بصد جلال
پلکیں اٹھیں ابل پڑیں آنکھیں وہ لال لال تیوری چڑھی لرزنے لگا عرصۂ قتال

---

[1] فارغ سیتاپوری "تیسرا مرثیہ" بند ۱۵۷، ص ۴۱
[2] " " " " بند ۱۵۸، ص ۴۱

خطِ نظر کھنچی ہوئی شمشیر بن گیا
چہرہ خدا کے قہر کی تصویر بن گیا [1]

تشبیہات کی ندرت، محاکات کی دل کشی اور تخیل کی رنگ آمیزی نے طرزِ بیان کو کس قدر معنی خیز بنا دیا "چہرہ خدا کے قہر کی تصویر بن گیا" لاجواب مصرع ہے بار بار پڑھیے تو تصویر کے نقوش ابھرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

رجز:

عرب میں شعرا نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے امن کے زمانے میں وہ اپنے قبیلہ والوں کے کارناموں کو فخریہ انداز میں بیان کرتے جنگ کے دوران وہ افرادِ قوم کی جرأت کو للکارتے اور ان کے جذبات کو ابھارتے عزم و ہمت اور جوانمردی کے نغمے بکھیرتے۔

زمانۂ قدیم سے عربوں میں یہ دستور چلا آتا تھا کہ جب ایک پہلوان دوسرے کے مدمقابل ہوتا تو وہ اپنے اسلاف کے کارہائے نمایاں بیان کرتا اور ان پر فخر کرتا۔ رجز رزمیہ شاعری کا جز بن گیا جس سے بہادری کے کارناموں کی یادیں دلوں میں تازہ ہو جاتی ہیں۔

فارغ سیتاپوری کی رزمیہ شاعری سے رجز کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام اعدا سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:-

کیوں کچھ سنا ہے زورِ ولایت مآب کا — نوجوں کے دل میں معرکہ خیبر کے باب کا
جھٹکیں پکڑ کے سر جو کرن کی طناب کا — ٹوٹے زمیں پہ گر کے کلس آفتاب کا
الٹیں بروج، یوں فلک نہ رواق پر
حالت تھی کنگروں کی جو کسریٰ کے طاق پر [2]

---

[1] فارغ سیتاپوری "دوسرا مرثیہ" بند ۲۷۶، ص ۷۰
[2] " " " " بند ۱۹۴ ص ۱۲۴

تم کیا اور فوج ضلالت شعار کی کیا بساط۔ فوج ظلم جو ڈر ڈر کے بھاگے اسے واپس لے آئیں تم کو اپنی صفوں پر ناز ہے۔

صف کیا ہے یہ ہوا پلٹ آئے جو گھیر لیں — کیسی ہوا، گئی ہوئی ساعت کو پھیر لیں ۵

ہم کو خداوند تعالیٰ نے کیا کچھ نہیں عطا فرمایا:

قدرت وہ ہے جو حکم وقوع محال دیں — پانی سے آگ، آگ سے پانی نکال دیں
قوت دکھائیں گر تو پہاڑوں کو ٹال دیں — رن بھر بھرائے ہاتھ جو قبضہ پہ ڈال دیں
نعروں سے قصرِ چرخ بریں کانپنے لگے
گاڑیں جہاں یہ پاؤں زمیں کانپنے لگے [1]

ہماری ضرب کا غیروں کے وار سے بھلا کیا مقابلہ ہماری تیغ سے زیادہ اور کوئی آبدار تیغ دنیا میں نہیں نہ ہم سا کوئی صف شکن اور شہسوار ہے اگر ہم:

دوڑا کے رخش باگ جو پنجے سے چھوڑ دیں
یہ صف تو کیا ہے سدِ سکندر کو توڑ دیں

اب آئیے ذرا حضرت عباسؑ کا رجز سنئے جس سے میدان جنگ کانپ کانپ اٹھتا تھا

ہم شیر بیشۂ اسدِ قلعہ گیر ہیں — ہم سرفروشِ راہِ خدائے قدیر ہیں
ہم جاں نثارِ خسروِ گردوں سریر ہیں — ہم ورثہ دارِ زورِ جناب امیرؑ ہیں
ہم ہیں کہ چلنے دیں نہ کسی پر وغا کا زور
ہم ہیں علی کا زور، علی میں خدا کا زور [2]

وہ زور جس سے ساکنِ خیبر ہوئے ہلاک — اب تک وہ در کھلا ہے بندھی ہے جہاں میں دھاک
قوت دکھائیں لے کے جو نامِ علیِ پاک — یوں ہاتھ پہ زمیں ہو ہتھیلی پہ جیسے خاک

---

[1] فارغ سیتاپوری "دوسرا مرثیہ" بند ۹۴، ص ۱۲۵
[2] " " "چھٹا مرثیہ" بند ۱۱۷ ص ۳۱

کرنا نہ ہو خراب جو دیرِ خراب کو
اسطرح رکھدیں پھر کہ نہ جنبش ہو آب کو ؎۱

مانا کہ فوج اعدا بہت ہے اور شاہ کے جان نثار کم لیکن ایسی چیونٹیوں کی قطاروں کا کیا شمار۔ شیرانِ روزگاران کو تو پاؤں سے روند ڈالیں گے۔ یہ تو حشرات الارض ہیں اگر فوج نہر پر آئے تو اسے ڈبو کر ہلاک کر دیں۔ حضرت علی اکبرؑ کا رجز بھی دشمنوں کے کلیجے ہلا دیتا ہے آپ فرماتے ہیں تمہاری فوج ہماری آنکھوں میں کیا سمائے گی کان دھر کر سن لو کہ ہم کو خدائے بزرگ و برتر نے وہ طاقت بخشی ہے کہ:

فوج کیا دھر کو ہم زیر وزبر کر ڈالیں! خاک ہو جل کے نظر قہر کی جس پر ڈالیں
یوں قدم گاڑ کے لڑنے کی بنا گر ڈالیں چھاتیاں ٹیک دیں کہسار وہ لنگر ڈالیں
سب تن لرزل سے ہوں خشکی کے مکیں پانی پر
ڈگمگانے لگے کشتی زمین پانی پر ؎۲

دنیا میں کسے تاب ہے کہ ہماری ہم سری کا دعویٰ کر سکے۔

نعرہ یہ تھا کہ ضیغم دشت وغا ہیں ہم فرزندِ ارجمندِ شہِ کربلا ہیں ہم
سیرت میں شیرِ خالقِ ارض وسما ہیں ہم صورت جو دیکھیے تو رسولؐ خدا ہیں ہم
جلوے ہیں ہم میں نورِ خداوندِ پاک کے
تم سب میں جان کیا ہے کہ پتلے ہو خاک کے ؎۳

فارغ کے مختلف مراثی میں امام حسینؑ کے عزیزوں کے علاوہ ان کے رفیقوں

؎۱ فارغ سیتاپوری "چھٹا مرثیہ" بند ۱۱۸، ص ۳۱
؎۲ " " " "تیسرا مرثیہ" بند ۱۱۵، ص ۳۰
؎۳ " " " "پہلا مرثیہ" بند ۲۰۰، ص ۵۱

کے "رجز" بھی لائق تحسین ہیں لیکن طوالت کے اندیشہ سے اس ضمن میں مزید بند نقل نہیں کئے جا رہے ہیں۔

رزمیہ شاعری کے سلسلے میں ہیرو کے رہوار کی تعریف سے بھی گریز ممکن نہیں اس کی تیز رفتاری معاذ اللہ کہیں چیتے کی جست، کہیں آہو کی رم، اس لئے سرعت بھی اس کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔

امام حسین علیہ السلام کے رخش کی تعریف سنئے:

کیا شانِ اشہب شہِ عالی وقار ہے — رن میں ظہورِ قدرتِ پروردگار ہے
سرعت یہ ہے کہ برق بھی جس پر نثار ہے — راکب وہ ہے جو دوشِ نبیؐ کا سوار ہے
غل تھا کہ پھاندتے فلکِ نہ رواق کو
دیکھا ہے اس فرس کو سنا ہے براق کو [۱]

حضرت علی اکبرؑ کے رہوار کے بارے میں فارغ کی بلند پروازی ملاحظہ ہو۔ ہٹ گئے روم و چین کی حدیں مل گئیں اور کھینچ کھینچ کے زمین کی طنابیں ٹوٹ گئیں اس کے بعد بظاہر اس موضوع پر ترقی کی گنجائش نہیں نظر آتی لیکن وہ فرماتے ہیں:

زور اس رخش سے آندھی کا بھی کب چلتا ہے — گرد پاتی نہیں کچھ چال عجب چلتا ہے
ساتھ پہنچے نہ تصور بھی غضب چلتا ہے — چال کا حال ہے یہ حال سے جب چلتا ہے
دم میں آئندہ زمانے کے ادھر جاتا ہے
پھر پلٹتا ہے تو ماضی سے گزر جاتا ہے [۲]

آندھی بھلا رخش کے مقابلے کی تاب کیسے لا سکتی ہے اس کی سرعت کا تو یہ

---

[۱] فارغ سیتاپوری "پہلا مرثیہ" بند ۱۴، ص ۵

[۲] " " " "تیسرا مرثیہ" بند ۱۴۲ ص ۳۷

حال ہے کہ اس کی گرد تک پہنچنا محال ہے۔ تصور بھی اس کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔

ایک اور بند غور سے پڑھیئے:

باگ روکے جو نہ اسوار وہ چلنے پائے
جا کے مغرب سے پھرے دن بھی نہ ڈھلنے پائے
گھیرلے گر تو عدو خاک سنبھلنے پائے
وقت جو ہو نہ وہ کاوے سے نکلنے پائے

اس جگہ عالم تصویر کا ہنگام رہے
صبح ہو صبح رہے شام جو ہو شام رہے ؎۱

زمان و مکان کا جو تصور فارغ نے مندرجہ بالا بند میں پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پرواز تخیل کس قدر ارفع و اعلیٰ ہے۔ مشرق سے مغرب کا فاصلہ آن کی آن میں طے کرنا رہوار کے لئے کوئی بات ہی نہیں۔ وقت کو کاوے میں مقید کر دیا ہے۔ بیت لاجواب ہے۔ رخش پرواز کر رہا ہے یہاں عالم تصویر کا ہنگام ہے۔ "صبح ہو صبح رہے شام جو ہو شام رہے" یہ مصرع بھی تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔

رخش کیا ہے خداوند تعالیٰ کی قدرت ہے اس کی رگ رگ میں برق کی سرعت بھری ہوئی ہے اس کے جسم میں جو خون دوڑتا ہے وہ اس کے لئے لطف نظر ہے اور اس کے دل کو راکب کے ارادے کی خبر دیتا ہے۔

تلوار کی تعریف:

رہوار کے بعد تلوار کا نمبر ہے شعراء نے اس سلسلے میں اچھوتی تشبیہیں استعمال کی ہیں اور نادر ترکیبیں وضع کی ہیں۔ فارغ کا اشہب قلم جولانی فکر سے ایسے ایسے مضامین تلاش کرتا ہے کہ وہم اور تصور کے بھی پر جلنے لگتے ہیں۔

انھوں نے امام حسینؑ کی تیغ کے جوہر بیان کئے ہیں:

؎۱ فارغ سیتاپوری "تیسرا مرثیہ" بند ۱۴۳ ص ۳۷

پنجہ وہ مہر دین کا وہ اوج ہلالِ تیغ !! — اک قدرت خدا تھا کہ جاہ و جلالِ تیغ
جائیں نہ چھوڑتا تھا دمِ بے زوالِ تیغ — بھاگے تو ساتھ ساتھ تھا سر میں خیالِ تیغ
پلٹے تو آ کے منہ پہ تھے ذوالفقار کے
عقل ان کی کٹ گئی تھی تصور سے دھار کے [1]

تیسرے چوتھے اور پانچویں مصرع کا ربط کس قدر معنی آفریں ہے۔ دشمن تیغ سے ڈر کر بھاگتے بھی تو ان پر دہشت طاری رہتی اور تیغ کا خیال ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوتا۔ بھلا ان کے لئے جائے مفر کہاں ؟ ذوالفقار کی مقناطیسی کشش سے وہ کیسے بچ سکتے تھے۔

"عقل کٹ جانا" محاورہ ہے لیکن دشمنوں کی عقل تیغ کے تصور کی دھار سے کٹ گئی تھی۔ صنعتِ مراعات النظیر نے چھٹے مصرع کو کس قدر معنی خیز بنا دیا۔

ایک مرثیہ میں تلوار نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے حضور میں یوں شکایت کی ہے :

زہرا کا باغ کاٹ کے باغی ہوں باغ باغ — یا شاہ جوہروں سے زیادہ ہیں دل میں داغ
سوکھے نہ ہوں گے خون سے بھر تھے جو دشت و راغ — اب تو سہی جو شام کو کر دوں نہ بے چراغ
گو آج موردِ غم و رنج کثیر ہوں
آقا میں ذوالفقارِ جنابِ امیر ہوں [2]

صنائع و بدائع کی مدد سے اور تشبیہات کا سہارا لیتے ہوئے فارغ نے ذوالفقار جناب امیرؑ کی اہمیت بھی جتا دی اور اسے نیام میں رکھنے سے دشمنوں کے جو حوصلے بڑھ گئے

---

[1] فارغ سیتاپوری "دوسرا مرثیہ" ۵۲۶ ص ۱۳۳

[2] " " " " بند ۵۱۴، ص ۱۳۰

تھے ان کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔

اب آیئے حضرت علی اکبرؑ کی تلوار کے جوہروں کی جھلک ذرا دیکھتے چلے حضرت علی اکبرؑ نے تلوار کھینچی تو قیامت کا منظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا زمین کو زلزل ہوا قہر خداوندی سے ڈر کر پہاڑ خاک کے تودے میں دھنس گئے یہی نہیں بلکہ افلاک میں بھی جنبش پیدا ہو گئی۔ ہولائے تند بھی تیغ کے خوف سے بھاگی، بد نظروں کی پلک بھی نہ جھپک سکتی تھی اور ان کی یہ کیفیت ہوئی:

جس پر پڑی جگہ سے نہ پھر وہ جواں اٹھا　　چاروں طرف سے غلغلۂ الاماں اٹھا
آفت مچی یہ صاعقہ گر کر جہاں اٹھا　　مل کر غبار زرد میں کالا دھواں اٹھا
کیا کیا گھمنڈ تھا انھیں ڈھالوں کی آڑ پر
بجلی نے گر کے آگ لگا دی پہاڑ پر [1]

موذی بڑھے تھے رن سے جو باندھے ہوئے قطار　　ناگن کی طرح تیغ لپکتی تھی بار بار
تھا شور ہر طرف کہ بگیرو۔ بدہ بدار　　بڑھ بڑھ کے کہہ رہی تھی اجل مار مار مار
لشکر میں فرد کو نہ اماں دے نہ زوج کو
غل ہو کہ سانپ سونگھ گیا ساری فوج کو [2]

غرض یہ کہ برق تیغ نے ہر صف میں قیامت مچا دی۔

"رزمیہ شاعری کے کمال کے چند شرائط ہیں واقعہ ایسا مہتم بالشان ہو جس نے دنیا کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیا ہو۔ لڑائی کے ہنگامے کا بیان اس زور شور اور پر رعب طریقے سے کیا جائے کہ دل دہل جائیں۔ سالار فوج اور مشہور بہادروں کی لڑائی کے

---

[1] فارغ سیتاپوری "پہلا مرثیہ" بند ۲۱۱، ص ۵۴

[2] 〃 〃 〃 〃 بند ۲۱۵، ص ۵۵

بیان میں لڑائی کے تمام داؤں پیچ ایک ایک کر کے دکھائے جائیں"۔ ؎۱

موضوع کی اہمیت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے حضرت امام حسینؑ کی مکہ معظمہ سے روانگی بعد ازاں کربلائے معلّیٰ میں ورود۔ کفر و ایمان کی جنگ بظاہر کفر کی فتح لیکن دراصل ایمان کی فتح ہوئی۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے کس قدر دل کش انداز میں اسی مفہوم کو ادا فرمایا ہے:

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

معرکۂ کربلا نے دنیا کی تاریخ میں انقلاب بھی پیدا کر دیا اور مذہب اسلام کی بنیادیں بھی استوار کر دیں خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمہ کی معرکہ آرا رباعی آج بھی شیدایانِ اسلام سے خراجِ تحسین وصول کر رہی ہے:

شاہ ہست حسینؑ بادشاہ ہست حسینؑ   دین ہست حسینؑ دین پناہ ہست حسینؑ
سر داد نہ داد دست در دستِ یزید   حقا کہ بنائے لا الٰہ ہست حسینؑ

علامہ اقبالؔ مرحوم نے اسی مفہوم کو یوں ادا فرمایا ہے:

زندہ حق از قوتِ شبیری است
باطل آخر داغِ حسرت میری است

یزید کی بیعت سے انکار کر کے امام حسینؑ نے ظلم و استبداد کی بنیادوں کو ہلا دیا آپ ہی کے حسن عمل سے دنیا میں اسلام کے اصول باقی رہ گئے۔ اس کے لئے آپ نے بڑی بڑی قربانیاں پیش کیں۔

بہرِ حق در خاک و خون غلطیدہ است   پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است

؎۱ شبلی نعمانی، مولانا "شعر العجم" جلد اول، ص ۱۲۰

معرکہ کارزار کی چند جھلکیاں :

پسر سعد نے نجس ہاتھ میں علم لیا اس کے پھریرے کا کھلنا تھا کہ فوجیں میدانِ جنگ کی جانب بڑھ گئیں اس کے بعد :

کڑکا ہوا اٹھیں پھریرے سرے یک بریک — تیغوں کی بجلیاں بھی دکھانے لگیں چمک
باجوں میں شام و روم کے تاشوں کی دھڑک — قرنا کا غل ڈہل کی گرج طبل کی گمک
پہنچی تھی بانگِ دف بھی بلندیِ مہر پہ
اتنی صدائیں دیتی تھیں ڈنکا سپہر پہ [۱]

الفاظ کے صحیح انتخاب کی وجہ سے میدان جنگ کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے افواجِ شام و روم کے باجوں میں تاشوں کی کڑک اور طبل کی گمک سنائی دینے لگتی ہے اور تھوڑی دیر کے لئے قاری سامع کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ معرکہ کارزار میں وہ بھی موجود ہے۔

حضرت "حر" حسینی لشکر کے ہراول تھے سب سے پہلے آپ ہی شہادت کے درجہ پر فائز ہوئے اس لئے سب سے پہلے انہی کے معرکہ کارزار کی ایک جھلک دیکھ لیجئے :

پہلے سنو ہراولِ فوجِ خدا کی جنگ — جرأت بڑھا رہی ہے حرِ باوفا کی جنگ
پڑھتا ہوں معرکہ میں ہر بروغا کی جنگ — آفت کا رن ہے حشر کا میدان۔ بلا کی جنگ
جھپٹا جو نازیوں پہ جری تیغ تول کے
مالک سرک گیا در دوزخ کو کھول کے [۲]

قربان تیز دستیِ جرارِ صف شکن — فرصت نہیں اٹھائیں جو ڈھالوں کو تیغ زن

---

[۱] فارغ سیتاپوری "دوسرا مرثیہ" بند ۱۶۰، ص ۴۱

[۲] " " " " بند ۳۱۶، ص ۸۰

زرہوں کے پرزے اڑ گئے ٹکڑے ہیں سب بدن　　گرتی ہے برق برق پہ پڑتا ہے رن پہ رن

بھاگڑ ہے ابر تیغ برستا ہے زور سے
باجوں کا غل چھپا ہے چھما چھم کے شور سے ؎۱

جو رن سے ٹل گیا موت اس کے سر سے ٹل گئی جس نے آنکھ ملائی اس کا دم نکل گیا جو بھاگنے میں گر پڑا وہ وہیں دب کر کچل گیا۔

اب آئیے علمدار لشکر کی آمد سے جو میدانِ کارزار کا حال ہو گیا اسکی عکاسی ملاحظہ فرمائیے۔ اعدائے دین میں ہلچل مچ گئی فوجوں میں انتشار پیدا ہو گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ:

چھپنے لگا ادھر کوئی دوڑا ادھر کوئی　　پہنچا بلند جا پہ برائے نظر کوئی
غائب ہوا پتنگ کے نشانِ ظفر کوئی　　بھاگا پھینک پھینک کے تیغ و سپر کوئی
سر کا کوئی صفوں سے فرس کو نکال کے
ڈوبا کوئی فرات میں گھوڑے کو ڈال کے ؎۲

"ہلچل ہے بے لڑے ہوئے لشکر کو ہے ہراس" اور غضب تو یہ ہے
غیرت نہیں کہ تیغ بکف بھاگے جاتے ہیں
جی چھوڑے اپنی اپنی طرف بھاگے جاتے ہیں

حضرت عباسؑ میدان میں پہنچ جاتے ہیں اس کے بعد کیا ہوا یہ فارغ کی زبان سے سنیئے:

اللہ رے نہیب سپاہِ ظفر قرین　　میداں سے دور ہٹ گئے دب دب کے اہلِ کین

؎۱ فارغ سیتاپوری "دوسرا مرثیہ" بند ۱۷، ص ۸۱
؎۲ " " "چھٹا مرثیہ" بند ۵۱۹، ص ۱۳۱

عباسؑ نے غضب میں جو گاڑا نشانِ دین　　　یا بوتراب کہہ کے لرزنے لگی زمین
کانپے اِدھر دھمک سے قدم ہر پلید کے
رائیت تمام ہل گئے فوجِ یزید کے ؎۱

جاتا ہے باد پا جو سمٹ کر اِدھر اُدھر　　　قہرِ خدا کی چلتی ہے صرصر اِدھر اُدھر
الٹا ہوا ہے فوج کا دفتر اِدھر اُدھر　　　اوپر تلے صفیں ہیں برابر اِدھر اُدھر
یوں کٹ کے پرے پروں پہ سپاہِ خراب کے
جیسے ورق ہوا میں مجلّد کتاب کے ؎۲

سینوں میں سب کے دل دمِ جنگ و جدل ہلے　　　گر گر پڑے جگہ سے جو اہلِ دغل ہلے
اللہ ری ضرب رن میں شجر بر محل ہلے　　　بجلی گری کہ ہل گیا میدان، جبل ہلے
دیکھے گئے نہ وار جو اس شیر مرد کے
گیتی نے منہ چھپا لیا دامن میں گرد کے ؎۳

"گیتی" بھی حملوں کی تاب نہ لا سکی اور خوف زدہ ہونے کے بعد اس نے گرد کے دامن میں اپنا منہ چھپا لیا۔

ایک اور مرثیہ میں حضرت عباسؑ کی جنگ کے منظر کی فارغ نے مرقع کشی کی ہے:

سب سے جدا تھی حربِ علم دارِ نامدار　　　جاتا تھا رن سے چرخ پہ غوغائے کارزار
بن کر صدائے کوہ پھر آتا تھا بار بار　　　گویا فلک پکار رہا تھا۔ بدہ بدار
نعرے کئے الٹ کے جو چاک آستین کے
گونجی صدا کہ پھٹ گئے طبقے زمین کے ؎۴

؎۱ فارغ سیتاپوری، "چھٹا مرثیہ" بند ۱۵۳، ص ۱۳۴
؎۲ " " "دوسرا مرثیہ" بند ۳۲۲، ص ۸۱:
؎۳ " " " " بند ۳۲۳، ص ۸۲
؎۴ " " "پہلا مرثیہ" بند ۶۰، ص ۱۶

آفت بپا تھی حشر تھا پڑتا تھا رن پہ رن لاشوں میں چھپ گئے تھے جوانانِ پیلتن
گرتی تھی برقِ تیغِ علمدارِ صف شکن دریا کے پاس آگ کا دریا تھا موجزن
چشمہ تھا خشک اہلِ ستم کی حیات کا
دب کر چھپا تھا ریت میں دھارا فرات کا [1]

حضرت عباسؑ کی جنگ قیامت تھی۔ ہر طرف حشر کے آثار نمودار تھے۔ دریا کے پاس آگ کا دریا موجزن تھا۔ حضرت علی اکبرؑ میدانِ جنگ میں تشریف لے جاتے ہیں "رن" کی کیفیت فارغ سے سنیئے:

ناگہ ڈہل بجا سپہ بدخصال میں شیروں کے دل دہل گئے دشتِ قتال میں
پیدا ہوا غضب کا تزلزل جبال میں گردوں سمٹ کے چھپ گیا بادل کی ڈھال میں
طبقہ زمین کا شور سے باجوں کے پھٹ گیا
آیا یہ زلزلہ کہ زمانہ الٹ گیا [2]

کالی گھٹا بڑھی کہ بڑھا لشکرِ گراں آثارِ حشر جو ہیں وہ ہونے لگے عیاں
قرنا ہوئی کہ صور پھنکا رن میں ناگہاں وہ غل کہ الحفیظ وہ نعرے کہ الاماں
تیغوں کی بجلیوں کا یہ عالم ہے شور میں
اک سیلِ آتشیں ہے کہ آتی ہے زور میں [3]

حضرت علی اکبرؑ فوجِ اعدا پر حملہ آور ہوئے نتیجہ یہ ہوا کہ:

تھرا کے پہلی صف پہ سواروں کا دل گرا یہ پہلواں سنبھل گیا جھک کر وہ یل گرا
ٹاپوں کے نیچے آگیا جو پر دغل گرا ٹھوکر یہ اس نے لی وہ فرس منہ کے بل گرا

---

[1] فارغ سیتاپوری "پہلا مرثیہ" بند ۶۱، ص ۱۷
[2] " " " " بند ۱۸۷، ص ۴۸
[3] " " " " بند ۱۸۹، ص ۴۹

پیدا تھی صبحِ حشر غضب گیر ودار تھی
گھوڑوں پہ اہلِ شام کے شامت سوار تھی [1]

جھپٹا جو ہاتھ اٹھا کے کوئی خانماں خراب شپ سے پڑی بغل کے تلے تیغِ لاجواب
یوں چار آئینہ میں در آئی بہ آب وتاب جس طرح ڈوب جاتا ہے لوہا میانِ آب
تڑپی تو خودِ سر کی طرف برمحل گئی!
گویا ہوا حباب میں بھر کر نکل گئی [2]

محشر بپا تھا اکبرِ غازی کی حرب سے آتی تھی الاماں کی صدا شرق وغرب سے
کیوں کر نہ جان دیں وہ شقی رنج وکرب سے مغفر سروں میں دھنس گئے قبضہ کی ضرب سے
صورت وہ اب کہاں ہے کسی بدخصال کی
سینوں میں سر اتر گئے اوجھڑ سے ڈھال کی [3]

فارغ فنونِ جنگ سے واقف تھے اور اس کی تمام جزئیات کے بیان کرنے پر قدرت رکھتے تھے اور زبان پر بھی۔ لفظوں کے صحیح انتخاب سے بیان میں کس قدر دل کشی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور کربلا کی رزم کا خونیں منظر ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

آخری شہید کی جنگ کا بھی ایک منظر پیش کیا جاتا ہے۔ اتمام حجت کے بعد:

تیغ دوسر پہ ہاتھ جو ڈالا امام نے کھنچتے ہی الحذر کی صدا دی نیام نے

---

[1] فارغ سیتاپوری "پہلا مرثیہ" بند ۲۰۷، ص ۵۴

[2] " " " " بند ۲۱۶، ص ۵۵

[3] " " " " بند ۲۱۷، ص ۵۶

اونچا کیا جو ہاتھ خدیو انام نے ستّر گزا و سر کو بڑھایا حسام نے
وار ایک سن سے کرکے جو لاکھوں پہ آ پڑے
اس صف کے سر اڑے ہوئے اس صف پہ جا پڑے ؎۱

امامؑ کے ایک حملے کے بعد فوجِ اعدا کی یہ حالت ہو گئی:

لاشے زمینِ گرم پہ پھڑکے لہو اُڑا لشکر کو پھاڑ کر فرسِ تند خو اُڑا
غل پڑ گیا جو مثلِ خبر چار سو اڑا گھوڑے بھگا ئیو اسدِ جنگ جو اڑا
ٹاپوں سے باب فتح و ظفر کھولنے لگا
بس ضرب دوسری تھی کہ رن بولنے لگا ؎۲

تیغ دو پیکر سن سن چل رہی تھی اس لئے ہر طرف بسمل پھڑک رہے تھے۔ بڑے بڑے جیالے پہلوانوں نے دہل کر رن چھوڑ دیا۔ جو شیر لشکر شکن بنتے تھے ان کے نشے ہرن ہو گئے جن کے پاؤں میں لنگر باندھے گئے تھے وہ بھی بھاگ گئے اور میدانِ جنگ خوف و دہشت کا شکار ہو گیا:

اللہ رے نعرۂ اسدِ شیرِ کردگار سچ یہ فلک کی چھت اڑتی تھی بار بار
آفت تھا بارِ ضرب گرانبارِ ذوالفقار اشجار کانپتے تھے دہلتے تھے کوہسار
ہلتا تھا بے ستون تو لرزتا تھا قاف بھی
کروٹ بدل رہی تھی زمین مصاف بھی ؎۳

وہ غلغلے بجوشش و بدار و بگیر کے وہ زلزلے رواقِ سپہرِ اثیر کے

؎۱ فارغ سیتاپوری "دوسرا مرثیہ" بند ۵۱۷، ص ۱۳۱
؎۲ " " " " بند ۵۱۸، ص ۱۳۱
؎۳ " " " " بند ۵۴۷، ص ۱۳۸

حملے وہ بادشاہِ سلیمان سریر کے ریلے وہ بھاگتی ہوئی فوجِ کثیر کے
بس پس کے ہر سوار و سمند ایک ہوگیا
کانپی زمین کہ پست و بلند ایک ہوگیا [1]

فارؔغ کی رزمیہ شاعری میں ولولہ بھی ہے اور جوش و خروش بھی۔ فنونِ حرب سے واقف ہونے کی وجہ سے انھوں نے مختلف معرکوں کے جو مناظر پیش کیے ان سے ان کے تخیل کی بلند پروازی، طبیعت کی روانی بلکہ الہامی کیفیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ انھوں نے اتنے طویل مرثیے لکھے لیکن کیا مجال کہ بند کہیں بے ربط معلوم ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قبضے میں الفاظ کا ایک بحرِ ذخار تھا جس کی روانی میں کمی نہیں ہونے پاتی تھی۔

فارؔغ مرحوم فصاحت و بلاغت سے بھی کماحقہ واقف تھے اس کا ثبوت ان کے مراثی سے ملتا ہے۔ انھوں نے رزمیہ شاعری میں پر شکوہ الفاظ استعمال کیے اسی لئے ان کے اندازِ بیان میں رعنائی اور دل کشی پیدا ہوگئی اور معرکہ کارزار کے بیان میں گھن گرج۔

فارؔغ نے رزمیہ شاعری کے مختلف پہلوؤں پر طبع آزمائی کی اور انیسؔ مرحوم کے فیضِ صحبت اور اپنی طبع کی جودت، خیالات کی ندرت، مضامین کی جدت کی وجہ سے اپنے آپ کو انیسؔ کا قابلِ فخر شاگرد ثابت کر دیا۔

---

[1] فارؔغ سیتاپوری "دوسرا مرثیہ" بند ۵۵۰ ص ۱۳۹

سیّد فضل علی وقارؔ

تلمیذ

خدائے سخن حضرت میر انیسؔ

کے

مراثی پر ایک نظر

سید فضل علی وقارؔ کے حالات کسی تذکرے میں نہیں ملتے اسی لئے خورشید خاوری کا دیباچہ من و عن نقل کیا جارہا ہے اسی کے ساتھ نفیسؔ مرحوم کی رباعیاں بھی تاکہ وقار کی سیرت کی چند جھلکیاں ارباب ذوق دیکھ سکیں" امابعد چوں کہ ذخیرہ مراثی من تصنیف عالی جناب سحبان زمان فرزدق دوراں افصح الفصحاء افسر الشعراء، مداح آل نبی سیّد فضل علی صاحب مرحوم المتخلص بہ وقارؔ رئیس اعظم زیدپور، ضلع بارہ بنکی، تلمیذ خدائے سخن حضرت انیسؔ مغفور اعلی اللہ مقامہ خاندان جناب مرحوم میں محفوظ چلا آتا تھا گو کہ امتداد زمانہ سے اکثر تصانیف مثل سلاموں اور رباعیوں کے تلف ہوگئیں جن کے لئے دست تاسف ملنا پڑتا ہے اسی خیال سے کئی بار کوشش بلیغ کی گئی کہ یہ خزینۂ لآلی مخزونہ حلیہ طبع سے مزین ہوکر خدمت حضرات مومنین و شائقین باتمکین میں پیش کیا جاوے تاکہ ذریعۂ

ایصال ثواب روح مصنف اعلی اللہ مقامہ ہو مگر کچھ ایسے اسباب رونما ہوتے رہے کہ یہ آرزو بار آور نہ ہو سکی، ہزار ہزار شکر ہے کہ میری سعی رائگاں نہ گئی جناب اخی المعظم قبلہ مسٹر سید عابد حسین صاحب[1] بیرسٹر ایٹ لا مدظلہ و برادر عزیز سید محمد عابد صاحب سلمہ رؤسا زید پور جن کے پاس یہ جواہر آب دار محفوظ تھے اور جو ورثاء مصنف مرحوم ہیں۔ خود مصارفِ طبع پر آمادہ ہو گئے لہٰذا جلد اوّل جو دس مرثیوں پر مشتمل ہے میں نے اور نور نظر سعید زمن سید شبیر حسن صاحب وفا بی اے ابن جناب معظم مسٹر عابد حسن صاحب[1] نے مرتب کی اور نام برعایت سنہ عیسوی "خورشید خاوری" ۱۹۳۷ء و برعایت سنہ ہجری "جلد ریاض وقار" ۱۳۵۵ھ قرار دیا۔ اگر کسی جگہ کوئی غلطی یا لغزش پائی جاوے تو مومنین ہماری کم علمی پر محمول فرما کر نظر انداز فرمائیں۔ مصنف مرحوم نے اپنی تمام عمر اسی شغل مداحی میں صرف فرمادی اس کے علاوہ فن تجوید اور اکثر علوم عربیہ میں بھی کافی دستگاہ حاصل تھی ۱۸۹۲ء میں اس عاریت سرائے فانی سے طرف ملک جاودانی انتقال فرمایا اور صرف یہ کلام اپنی یادگار چھوڑا۔ لاش مرحوم کی کربلائے معلیٰ جناب خان بہادر سید شرف علی صاحب ریٹائرڈ سب جج مرحوم نے جو حقیقی برادر زادہ مرحوم تھے روانہ فرمائی۔ اب جوار سید الشہدا علیہ التحیۃ والثنا میں آرام فرما ہیں۔ جناب مرحوم کی مجلس چہلم جانشین انیسؔ یعنی جناب میر خورشید علی صاحب نفیس مرحوم نے خود پڑھی اور چار رباعیاں تصنیف کر کے پڑھی تھیں جن سے ظاہر ہو گا کہ کس پایہ کے بزرگ تھے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ کب راہروِ ملکِ عدم ملتے ہیں — ملتے ہیں نہ وہ ہم سے نہ ہم ملتے ہیں
سید فضلِ علی کا جانکاہ ہے غم — ایسے بھی دوست جہاں میں کم ملتے ہیں

۱؎ "مسٹر اور صاحب" دونوں کا ساتھ لکھنا درست نہیں۔ "مسٹر" اور "صاحب" دونوں ہم معنی ہیں فرق یہ ہے کہ ایک لفظ انگریزی ہے اور دوسرا اردو

۲۔ گردش ہے عجیب یہ زمانے کے لئے
سب آئے ہیں اس دہر سے جانے کے لئے
احباب تو ہنستے گئے دنیا سے نفیس
ہم رہ گئے اشکِ خوں بہانے کے لئے

۳۔ دردا کہ عجیب یار موافق چھوٹا
صد حیف بڑا محب صادق چھوٹا
کیا حالتِ دل زباں پہ لاؤں میں نفیس
کافی ہے کہ مجھ سے مرا عاشق چھوٹا

۴۔ ہم جن کے لئے آئے وہ ہیہات کہاں
سب اہل سخن ہیں یاں پہ وہ بات کہاں
مانا کہ کبھی خواب میں دیکھیں گے نفیس
وہ سلسلۂ حرف و حکایات کہاں

مصنف مرحوم اعلیٰ اللہ مقامہ کے سلاموں اور رباعیوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا مگر نہایت افسوس ہے کہ وہ امتدادِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا تلف ہو گیا۔ چند شعر دو سلاموں کے جو زبان زد رہ گئے تھے نقل کرتا ہوں اور ایک سلام پورا اور پانچ شعر دوسرے سلام کے دستیاب ہو سکے جو جلد میں طبع ہو گئے ہیں اگر شائقین نے قدر دانی فرمائی تو قسط وار بقیہ کلام پیش کش کرتے رہیں گے۔ ابھی کافی ذخیرہ موجود ہے:۔

خواہشِ اکسیر و حرصِ کیمیا رکھتے نہیں
پاس کچھ جز ضُرّہ خاکِ شفا رکھتے نہیں
زر نہ دنیا ہو نہ دے منعم دلوں کو تو نہ توڑ
ان کی سنتا ہے خدا گو یہ صدا رکھتے نہیں

ایضاً دیگر

قید زنداں میں رہے موسیٰ بن جعفر اس قدر
گھستے گھستے پاؤں میں زنجیر آدھی رہ گئی
حال دل بھائی سے کہنے بھی نہ پائی تھی بہن
جنگ کو سرور چلے تقریر آدھی رہ گئی[۱]

سید فضل علی وقار کا رنگ گندمی تھا وہ لحیم و شحیم واقع ہوئے تھے اس زمانے کے دستور کے مطابق وہ چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے داڑھی بھی رکھتے تھے۔ انگرکھا یا شیروانی اور بڑے پائنچوں کا پاجامہ زیب تن فرماتے ہے[۲]

۱؎ طالب زید پوری، سید علی محمد "خورشید خاوری ریاض وقار" از وقار، سید فضل علی۔ نظامی پریس ۱۹۳۷ء بار اول، (دیباچہ) ص ۴-۱

۲؎ سید ظہیر الحسن صاحب، سابق تحصیلدار ریاست سلیم پور ساکن لیاقت آباد کراچی نے وقار مرحوم کا حلیہ اپنے حافظہ سے راقم الحروف کو بتایا۔

وقارؔ مرحوم سید ابو علی بن سید عابد حسین زید پوری کے خلف الصدق تھے میر انیسؔ سے تلمذ رکھتے تھے، حضرت فروغؔ سیتاپوری رقم طراز ہیں کہ "راقم جس زمانے میں میر نفیسؔ اعلیٰ اللہ مقامہ کی خدمت میں مرثیہ پڑھنے کو جاتا تھا تو وہاں اکثر سید فضل علی وقارؔ موصوف سے نیاز حاصل ہوتا تھا۔ آپ میرے حال پر بہت شفیق تھے۔ . . آپ کی شادی مسماۃ شمس النساء دختر سید جعفر حسین سے ہوئی تھی کوئی اولاد نہیں بلا اعقاب انتقال کیا . . . . . . آپ نے اپنی حیات میں زیارت عتبات کا شرف حاصل کیا تھا اور بعد انتقال کے بھی آپ کی لاش کربلائے معلی بھیجدی گئی"[۵۱]

سید یونس حسین یونسؔ زید پوری شاگرد حضرت مرزا اوجؔ کے ایک قطعہ سے بھی وقارؔ مرحوم کی سیرت اور ان کی شاعری پر کچھ روشنی پڑتی ہے ملاحظہ فرمائیں:

جناب فضلِ علی باوقار و عارف تھے   بجا ہے ایسے ہی بندوں کو باخدا کہنا
گلِ کلام میں خوشبو و رنگ انیسؔ کا ہے   صحیح ہے، نہیں ہرگز غلط مرا کہنا
خدا کا فضل ہے مرحوم کا یہ حصّہ ہے   ہر اک کا کام نہیں یوں زبان کا کہنا
کلام چھپ گیا ہے دیکھیں صاحبانِ نظر   پڑھے ہوئے کو ہے لازم پڑھا ہوا کہنا
زروئے حسن یہ تاریخ لکھی یونسؔ نے   وقار کے یہ مراثی ہیں ان کا کیا کہنا[۵۲]

۱۳۵۵ھ

وقارؔ مرحوم کے مرثیوں کی وہ فہرست نقل کی جا رہی ہے جو "خورشید خاوری" میں درج ہے۔

---

۵۱ فروغؔ سیتاپوری "شجرات طیبہ" سیتاپور: امیر المطابع، ۱۹۱۸ء بار اول ص ۹۵-۳۹۴
۵۲ وقارؔ "خورشید خاوری" محولہ بالا، ص ۱۷۶

فہرست مراثی

نمبر شمار	مطلع	موضوع	تعداد بند
۱	للہ الحمد کہ پھر طبعِ رسا اوج پہ ہے	حضرت رسول خداؐ	۲۰۷
۲	حسنِ سخن ثنائے جناب امیر ہے	حضرت امیر المومنینؑ	۱۷۸
۳	حسن رخ کلام ثنائے بتولؑ ہے	جناب فاطمہؑ	۱۰۷
۴	کس مدح سے سرسبزی گلزارِ سخن ہے	حضرت امام حسنؑ	۱۱۶
۵	کعبہ کی طرف قبلۂ ایمان کا سفر ہے	سفر حضرت امام حسینؑ	۸۳
۶	پرچم کشا فلک پہ جو مہرِ مبیں ہوا	جناب عون و محمدؑ	۲۳۲
۷	الٹا جو حورِ صبح نے رُخ سے نقاب کو	حضرت قاسمؑ	۱۵۸
۸	آمد ہے رن میں ضیغمِ شیر الٰہ کی	حضرت عباسؑ	۱۳۲
۹	جب چھٹ گئے عباسِؑ دلاور شہِ دیں سے	حضرت علی اکبرؑ	۱۷۰
۱۰	اے زباں بحرِ طبیعت کی روانی دکھلا	حضرت امام حسینؑ	۱۶۲

دقارؔ مرحوم خلقتاً نہایت دیندار نیک اور پاک طینت واقع ہوئے تھے، انھوں نے جس قدر سلام لکھے یا رباعیاں تصنیف کیں وہی ان کا سرمایۂ حیات بھی ہے اور توشۂ آخرت بھی ان کے مراثی پر نہ کسی نے تبصرہ کیا اور نہ ان پر کوئی تنقیدی مضمون اب تک میری نظر سے گزرا۔[۱]

---

[۱] محترم افسر صدیقی امروہوی نے نشاندہی فرمائی کہ دقارؔ پر ایک مضمون "الواعظ" بابت یکم مارچ ، ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا لیکن وہ اب تک دستیاب نہ ہوسکا۔
ق ۔ ح ۔ جعفری

اس لئے اس مضمون میں ان کے مرثیوں کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہوگا۔ اس ضمن میں وقار کے چند مرثیوں سے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں تاکہ ان کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات کا اندازہ ہو سکے۔

مرقع کشی :-

شاعر واقعات اور حالات کا جائزہ لیتا ہے اور قلبی کیفیات کو نظم کے خوبصورت سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ امام حسینؑ کی روانگی کے وقت جو اہل مدینہ کی حالت ہوئی اس کی مرقع کشی ملاحظہ ہو:

شبیرؑ چلے کیا ہوا ویران مدینہ بے نوح تباہی سے بچے گا نہ سفینہ
بیکار وہ خاتم ہے نہ ہو جس پہ نگینہ جب دل ہی جدا ہو گیا بے نور ہے سینہ
رونق تھی مدینہ کی اسی شاہ کے دم سے
فریاد کہ ہم چھٹتے ہیں آقا کے قدم سے[۱]

مندرجہ بالا بند میں صناعی بھی ہے تشبیہ کی معنی آفرینی بھی، تلمیح کی چاشنی بھی اور جذبات کی ترجمانی بھی۔

ایک اور بیت بھی پیش خدمت ہے:

تیار سفر کرنے پہ سب چھوٹے بڑے ہیں باندھے ہوئے کمریں رفقا شہ کے کھڑے ہیں

سفر کی تیاری کا منظر نہایت اختصار سے بیان کیا گیا لیکن ہے کس قدر جامع۔ جو لوگ امام حسینؑ کو رخصت کرنے کے لئے آئے وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ سکے۔ ایک تو دفور جذبات کی وجہ سے دوسرے امام حسینؑ کے وقار کے پیش نظر۔ ان کی حالت شاعر نے ایک بیت میں کس خوب صورتی سے بیان کی:

سب صورتِ تصویر ہیں خاموش ادب سے پر چین کسی دل کو نہیں رنج و تعب سے

۱؎ وقار، ''خورشید خاوری'' تیسرا بند ص ۶۹

"صورت تصویر" کا ٹکڑا افراد کی مرقع کشی کے لئے کس قدر با محل ہے۔

اٹھارہ جوانان بنی ہاشم امام حسینؑ کی نصرت کے لئے کمربستہ ہیں وہ دلیر بھی ہیں اور بہادر بھی ان میں جوش وولولہ ہے ان کو اس امر کا یقین ہے کہ وہ حق کا ساتھ دے رہے ہیں اسی لئے جام شہادت پینے کے لئے بے قرار نظر آتے ہیں۔

اک سمت جلوہ گر وہ جوانان حیدری — لرزاں تھا جن کے خوف سے خورشید خاوری
یکتائے روزگار تھا ان میں ہر اک جری — رستم بھی ہو تو کر نہ سکے ان سے ہمسری
چڑھتا تھا شیر بھی نہ کسی کی نگاہ میں
وہ سب پلے تھے بیشۂ شیر الٰہ میں[1]

چھٹا مصرعہ کس قدر بولتا ہوا ہے اور معنوی نقطۂ نظر سے مکمّل۔ وہ جوانان ہاشمی بیشۂ شیر الٰہ میں پلے ہوئے تھے لہٰذا جو اُن کی بہادری میں شک لائے وہ کافر۔

محاکات :-

شاعر مصوری کے فرائض بھی انجام دیتا ہے وہ الفاظ سے ایسی مکمل تصویر پیش کرتا ہے جو اصل سے بازی لے جا سکتی ہے ایسے وقت شاعر مصور سے بھی چند قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔

حضرت قاسمؑ بھی امامؑ کے ہم راہ عازم سفر ہیں ان کے ہمجولی ان کو رخصت کرنے کے لئے آگئے ہیں ان کی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت کی شاعر نے کتنی صداقت سے عکاسی کی ہے،

قاسمؑ کے قریں جمع ہیں سب شہر کے اطفال — رُخ زرد ہیں اور آنکھیں بکا کرنے سے ہیں لال
دوڑے ہوئے آئے ہیں گھروں سے تو ہے یہ حال — منہ خشک ہیں الجھے ہوئے ہیں گیسوؤں کے بال
سر تا بہ قدم خاک میں تن ان کے اَٹے ہیں
کرتوں کے قباؤں کے گریبان پھٹے ہیں[2]

---

[1] وقار، حوالہ مذکورہ بالا۔ آٹھواں بند، ص ۶۹
[2] ایضاً — بارھواں بند، ص ۷۰

جذبات نگاری :-

انیس مرحوم کو جذبات نگاری میں یدطولیٰ حاصل تھا دقار بھی اپنے استاد کے فیضان سے اس دشوار گذار منزل سے نہایت کامیابی سے گزر گئے ۔ حضرت صغرا کو جب یقین ہوجاتا ہے کہ امام حسینؑ ان کو۔۔ اس پر خطر سفر میں اپنے ساتھ لے جانے سے قاصر ہیں تو اُن کی مایوسی کا اظہار درد بھرے الفاظ میں دقار کی زبانی سنئے :

خالی نظر آئے گا مجھے جب یہ بھرا گھر ٹکراتی پھروں گی در و دیوار سے میں سر
بہلائے گا پھر کون ۔ کہاں ہوئیں گی مادر بہنیں نہ ملیں گی مرا دل ہوئے گا مضطر
ہر روز تڑپنے میں گذر جائے گا مجھ کو
یادِ علی اصغر میں نہ خواب آئے گا مجھ کو[1]

آسان اور سلیس زبان میں درد انگیز جذبات کا اظہار دل کو تڑپا دینے کے لئے کافی ہے ۔ جذبات نگاری کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو ۔ حضرت زینبؑ کے دونوں صاحب زادگان (عون و محمدؑ) کو اس امر کا افسوس ہے کہ ان کو لشکر کا علم نہیں ملا، اپنے زعم میں وہ علم کے حقدار تھے حضرت زینبؑ کس طرح دونوں کو سمجھاتی ہیں :

کیا جانو تم کہ مجھ کو ہیں فکریں بڑی بڑی بے ہوش ہوں کہ جان شہِ دین میں ہے لڑی
بھائی کی خیر مانگ رہی ہوں کھڑی کھڑی لو تم کو ایسے وقت میں منصب کی ہے پڑی
شب سے ہجومِ حسرت و رنج و ملال ہے
اس کا نہیں خیال کہ کیا ماں کا حال ہے[2]

چوتھے مصرع میں "لو" جس انداز سے نظم ہوا ہے اس سے نسوانی طرزِ گفتگو کی صحیح عکاسی ہوتی ہے ۔ چھٹا مصرع کس غضب کا ہے ۔ ایک ماہر نفسیات ہی اس کی

---

[1] حوالہ بالا ، بند ۱۸۱ ، ص ۳۷
[2] حوالہ بالا ، بند ۳۰ ، ص ۸۲

توجیہ کر سکتا ہے۔ حضرت زینبؑ فرماتی ہیں کہ سب سے بڑا منصب یہی ہے کہ تم شہادت کے مرتبہ پر جلد سے جلد فائز ہو:

سمجھائے دیتی ہوں تمھیں اس کا رہے خیال — منصب کا نام لوگے تو ہوگا مجھے ملال
خادم ہو شہ کے تم کو شرف ہے یہی کمال — کرتے رہو غلامیٔ آقائے خوش خصال
منصب کا ذکر لب پر نہ لاؤ تو خوب ہے — شہ کے قدم پہ سر جو کٹاؤ تو خوب ہے[۱]

حضرت علی اکبرؑ جنگ کے لئے تیار ہیں اور معرکہ کارزار میں جانے کے لئے بیقرار، شاعر نے امام حسینؑ کے جذبات کی ترجمانی سلیس اور آسان اردو میں کی ہے۔

سچ ہے مرے احوال کی تم کو ہے خبر کیا — کیا جانو ابھی تم کہ ہے یہ دردِ جگر کیا
جو دل نہیں مغموم اسے غم کا اثر کیا — اولاد نہیں جس کے اسے قدرِ پسر کیا

مغموم جو ہو قدرِ مصیبت وہی جانے
جو زخمی ہو بسمل کی حقیقت وہی جانے[۲]

سادہ الفاظ میں کس قدر درد پوشیدہ ہے۔ غم زدہ کو غم کا احساس ہو سکتا ہے اور یہ کس قدر صداقت پر مبنی ہے کہ جس کے اولاد نہ ہو اسے بیٹے کی محبت کی کیا قدر ہو سکتی ہے[۳]

جذبات نگاری کی ایک اور مثال پیش کی جاتی ہے۔ حضرت امام حسینؑ جب اپنے دونوں بھانجوں (عون و محمد) کے لاشے میدان سے خیمے میں لاتے ہیں تو غم زدہ ماں کا دل بھر آتا ہے لیکن امام حسینؑ کی موجودگی میں اپنے جذبات کا اظہار کیسے کرتی۔ ماں ہی تو ہیں زبان سے کچھ نہ کہا مگر قلبی کیفیات ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

۱؎ حوالہ مذکورہ، بند ۳۲، ص ۸۲
۲؎ ایضاً، بند ۱۶، ص ۱۳۹
۳؎ انیس مرحوم نے خوب کہا ہے: "دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے"۔

تعریف بھانجوں کی جو کی شہ نے اس قدر — لاشوں کی سمت یاس سے زینب نے کی نظر
ماں کو جو دونوں لال نظر آئے خوں میں تر — دل میں اٹھا یہ درد کہ تھرا گیا جگر
بولی مگر ادب سے نہ شاہِ انام کے
بس رہ گئی خموش کلیجے کو تھام کے [۱]

وقارؔ کے مرثیوں میں جذبات نگاری کے اور بھی بہت سے نمونے ملیں گے لیکن طوالت کے خوف سے نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔

منظر نگاری:

مرثیے میں مناظرِ قدرت کا بیان سب ہی شعرا کرتے ہیں لیکن وہی مرثیہ نگار کامیاب ہوتا ہے جس کا مشاہدہ وسیع ہو۔ تخیل کی کارفرمائی کے علاوہ اس میں قادر الکلامی کے جوہر بھی پائے جاتے ہوں طبع کی جولانی کے ساتھ ساتھ داخلی کیفیات کے اظہار کی قابلیت بھی ہو۔ وقارؔ کے مرثیوں سے چند بند ملاحظہ فرمائیے اور منظر نگاری سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کیجیے:

وہ وقت صبح اور وہ ظہورِ آفتاب کا — جھونکے نسیم کے وہ مہکنا گلاب کا
وہ سبزہ زار۔ لطف وہ نہروں کے آب کا — وہ ہر شجر پہ دشت کے جوبن شباب کا
تھا رشکِ خلد کو چمنِ لالہ زار سے
طاؤس چرخ وجد میں تھا اس بہار سے [۲]

صبح عاشور کی منظر نگاری بھی قابلِ ذکر ہے۔ عاشور کی صبح ہوتے ہی انجم سپہر چشم سے روپوش ہونے لگے۔ شب کے چراغ خاموش ہونے لگے شش جہت سے خدائے بزرگ و برتر کی قدرت نمایاں تھی مرغانِ باغ بھی خالقِ حقیقی کی عبادت

۱؎ حوالہ بالا، بند ۲۲۰، ص ۱۰۳

۲؎ حوالہ بالا، پانچواں بند، ص ۷۹

کر رہے تھے۔

مشغول تھے خدا کی عبادت میں سب طیور ۔ یاحق کسی زبان پہ کسی لب پہ یا غفور
کرتی تھیں قمریاں کبھی نہ اوراد میں قصور ۔ حق سرہ کی جاتی تھی آواز دور دور

جو بے زبان تھے سنتے تھے ذکرِ ثواب کو
سبزہ نے ترک کر دیا تھا لطفِ خواب کو[1]

ہر گل میں نئی بہار تھی انواع و اقسام کے رنگین پھول کھلے ہوئے تھے ہر خطّہ چمن گلدستہ بنا ہوا تھا قدرت نے خود اس کے لئے خاص اہتمام کیا تھا ؛

وہ دل فریب سبزۂ نوخیز کی لہک ۔ گویا بچھا تھا فرش زمرد کا دور تک
ہوتی تھی دیکھنے سے خنک جس کے مردمک ۔ مینو سواد ہونے میں اس کے نہیں تھا شک ،

فائق ملاحت اس کی تھی مخمل کے خواب پر
سبزہ نہ تھا بہار تھی جوشِ شباب پر[2]

اشجار قطار باندھے ہوئے تھے جن کے قد نہ تو بہت بلند تھے اور نہ بہت پست ، ہر شجر تازگی میں فرد تھا ، جس کے پاس باد سموم پہنچ کر گرد ہو جاتی ۔

شاعری میں منظر کشی کا مرحلہ نہایت دشوار اور کٹھن ہوتا ہے لیکن وقار کے مرثیوں میں منظر نگاری کے نہایت عمدہ عمدہ نمونے ملتے ہیں جو ان کی قادر الکلامی کا بیّن ثبوت ہیں ۔

سیرت نگاری :۔

مرثیہ کا ہیرو چند خصوصیات کا حامل ہوتا ہے لیکن ماہر نفسیات کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام افراد کی سیرتوں میں فرق مراتب کو مدنظر رکھے شاعر کو بھی اسی کے نقش قدم پر

---

[1] ایضاً چوتھا بند ، ص ۱۰۵

[2] حوالہ بالا ، نواں بند ص ۱۲۳

چلنا پڑتا ہے۔ انیس مرحوم کے مرثیوں میں سیرت نگاری کے لاجواب نمونے ملتے ہیں، وقار نے بھی سیرت نگاری کا حق ادا کر دیا۔

حضرت عباسؑ، امام حسینؑ کے بھائی تھے، لیکن ہمیشہ وہ اپنے آپ کو ان کا غلام تصور کرتے تھے۔ وہ حسینی لشکر کے علمبردار تھے اور نہایت شجاع واقع ہوئے تھے "سقائی اہلبیت" کا لقب بھی انھیں عطا کیا گیا تھا۔ حسب ذیل بند پڑھئے جس میں ان کی سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے:-

سب اس دلیر میں ہے علیؑ کی شکوہ و شان قوت وہی ہے اور وہی ساری آن بان
انسان تو کیا جنوں کی نکلتی ہے ڈر سے جان آٹھوں پہر ہے سبطِ نبیؐ کی رضا کا دھیان
جو عشق تھا نبیؐ سے شہِ ذوالفقار کو
الفت ہے شاہ سے وہی اس نامدار کو [۵]

وقار حضرت عباس کی وفاداری اور امام حسینؑ سے ان کے عشق کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ اس لئے انھوں نے مندرجہ بالا بیت میں مثال دے کر اپنے مفہوم کی وضاحت کر دی۔

عاشور کے دن جب امام حسینؑ کے تمام رفقاء اور اعزہ شہید ہو گئے اور ظہر کے وقت وہ تن تنہا رہ گئے اس وقت بھی ان کی یہ کیفیت تھی کہ:

فرق تھا کچھ نہ مگر صبر و شکیبائی میں تھی خدا پر نظر اس عالم تنہائی میں

یہ ہے امام حسینؑ کی سیرت کی ایک جھلک سب کچھ رہ خالق میں لٹانے کے بعد بھی یہ ان ہی کا دل و جگر تھا کہ صبر میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔

جب امام مظلوم آخری رخصت کے لیے خیام اہل بیت میں تشریف لے گئے تو صبر کی کس طرح تلقین فرمائی:

دیکھ کر سب کو یہ حسرت یہ کہا شاہ نے تب تن تنہا ہوں عزیز و رفقاء جا چکے سب

۵۔ ایضاً چھٹا بند، ص ۱۲۳

لشکرِ ظلم وستم اب مجھے کرتا ہے طلب
میں بھی جاتا ہوں تمھیں سونپ کے اللہ کو اب
آہ وزاری نہ کسی رنج و بلا میں کرنا
قید کے دن بھی بسر صبر ورضا میں کرنا[1]

حضرت زینب کو اپنے بھائی سے بے انتہا محبت تھی امام حسینؑ نے وقت رخصت اپنی بہن سے تسکین آمیز جملے ادا فرمائے اور وجہ شہادت بھی بیان کردی۔

قتل اور قید کو ہم تم نہ گوارا کریں گر
بخششِ امتِ محبوب خدا ہو کیوں کر
ہم کو توعید ہو گردن پہ پھرے گر خنجر
تم اسیری کی جفاؤں میں رکھو حق پہ نظر
شاد ہو روح نبیؐ صبر وشکیبائی پر
حق تو نانا کا مساوی ہے بہن بھائی پر[2]

وقار کے مختلف مرثیوں میں بہت سے ایسے بند ملیں گے جن میں انھوں نے سیرت نگاری کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیے۔

سراپا:۔

مرثیہ کی رزمیہ شاعری میں سراپا کے موضوع سے بخوبی عہدہ برآ ہونا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں کیونکہ سراپا کے بیان کرنے کے لئے لکھنے والے کو پرشکوہ الفاظ کی جستجو ہوتی ہے تاکہ ہیرو کی شان وشوکت میں کسی طرح کی کمی نہ ہونے پائے۔ وقار نے حسب ذیل بند میں حضرت عباسؑ کا سراپا نظم کیا۔ تلمیحات بھی ایسی استعمال کیں جن کا تعلق علمبرداری سے ہے اور شجاعت سے بھی۔ وہ سیّدِ لولاک[3] کا علم تھا جو زیب دوش تھا۔

آگے تھے سب سے حضرت عباس ذی حشم
بر میں زرہ تھی ڈاب میں شمشیر برق دم
تھے دبدبہ میں حمزہؑ وجعفرؑ سے کچھ نہ کم
تھا زیب دوش سیّدِ لولاک کا علم

---

[1] حوالہ بالا، بند ۲۴، ص ۱۵۹

[2] ایضاً ، بند ۴۱، ص ۱۶۱

[3] حدیث قدسی "لولاک لما خلقتُ الافلاک" (اے رسول! اگر تم نہ ہوتے تو یہ کائنات خلق نہ کی جاتی۔ تم ہی تو وجہ تخلیق کائنات ہو)

مصروف لب تھے وصفِ شہِ نامدار میں[۱]
ضیغم کی طرح گونج رہے تھے کچھار میں[۲]

دیکھئے وقار نے ایک مرثیے میں حضرت علی اکبرؑ کا سراپا تشبیہات کا سراپا لے کر کس خوبی سے نظم کیا ہے:

بائے سرِ بسم اللہ قرآں ہیں جو ابرو — بسم اللہ اسی بیت کی تعریف سے کر تو
تشبیہ وہ لکھ جس میں نہ ہو فرقِ سرِ مو — چھوٹے نہ ثنا کا کوئی گوشہ کوئی پہلو
ممتاز ہوں مدحِ پسرِ سرورِ دیں میں
ہر بات پہ اک بیت ملے خلدِ بریں میں[۳]

مداح کو مشکل ہے رُخِ پاک کی مدحت — صانع نے بنائی ہے عجب نور کی صورت
جس طرح محمدؐ پہ ہوئی ختم رسالت — ختم ان پہ اسی طرح ہوئی حسن کی دولت
بے مثل اسے صفحۂ ایجاد میں پا کر
صانع نے قلم رکھ دیا یہ نقش بنا کر[۴]

حسن کا نقش آخر تو یہی ہے اور اس صانع کی قدرت کا نمونہ بھی ہم شبیہ پیغمبرؐ جو ہوئے۔

رجز:-

عرب میں زمانہ جاہلیت سے یہ دستور چلا آرہا تھا کہ جب طرفین کے بہادر میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے سامنے آتے تو اپنے اپنے خاندان کے فضائل

۱۔ حوالہ بالا، بند ۶۹، ص ۸۶

۲۔ انیسؔ مرحوم کی بیت بھی ملحوظ خاطر رہے:
کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے — نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے
استعارے کی وجہ سے انیسؔ کی بیت بہت بلند ہے۔ وقارؔ نے تشبیہ استعمال کی۔

۳۔ حوالہ بالا، بند ۴۹ ص ۱۴۳

۴۔ حوالہ بالا، بند ۵۴ ص ۱۴۳

میں فخریہ اشعار پڑھتے جن سے ان کے حسب و نسب کا علم ہوتا اور اسلاف کی بہادری کے تذکرے ہوتے ۔ شمالی ہند میں جب مرثیہ نے ترقی کی تو اس میں رجزیہ اشعار بھی لکھے گئے اور ''رجز'' مرثیہ کا ایک جزو بن گیا ۔

حضرت قاسمؑ جب میدان جنگ میں جاتے ہیں تو اپنے جدِ امجد کی تعریف کرتے ہیں ۔ اپنی شجاعت کا تذکرہ اور اپنے شوقِ شہادت کا اظہار فرماتے ہیں :-

شہ زور جتنے دہر میں ہیں ہم سے زیر ہیں ۔۔۔ سب جس کا لوہا مان گئے وہ دلیر ہیں
شائق شہید ہونے کے جینے سے سیر ہیں ۔۔۔ ہم شیرِ کردگار کے بیشہ کے شیر ہیں
شادی ہے سر کٹانے کی خالق کی راہ میں
لشکر یہ کب سماتا ہے اپنی نگاہ میں[۱]

حضرت قاسمؑ کے نقطۂ نظر سے بہادر کہلائے جانے کا وہی مستحق ہے جس کے دل میں دین کا درد ہو اور خداوند تعالیٰ کے علاوہ کسی سے خائف نہ ہو :-

ہے وہ دلیر قلب میں جس کے ہو دین کا درد ۔۔۔ غیر از خدا ڈرے نہ کسی سے وہی ہے مرد
منظور ہے جو مجھ سے مقابل ہو فرد فرد ۔۔۔ یا جتنی یہ سپاہ ہے مل کر کرے نبرد
وسواس کچھ نہیں سپہ بے شمار سے
ہوتے ہیں شیر صید فگن کب شکار سے[۲]

حضرت عباسؑ کا رجز بھی قابلِ ذکر ہے آپ میدانِ کارزار میں تشریف لے جاتے ہیں اور شمر سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ تیری یہ طاقت کہ مالکِ کوثر پر پانی بند کرتا ہے اچھا دے حکم ساری فوج کو روکے مجھے شتاب :

یہ ناممکن ہے کہ تمام فوج نہر فرات پر پہنچنے سے مجھے روک سکے اس کی وجہ یہ ہے کہ :-

---

۱۔ حوالہ بالا ، بند ۶۹ ، ص ۱۱۲
۲۔ حوالہ بالا ، بند ۷۱ ، ص ۱۱۲

میں اس خدا کے شیر کے بیشہ کا ہوں اسد | بیر العلم[۳] سے پانی جو لایا بہ جد و کد
کب آنکھ میں سماتی ہے یہ فوجِ لاتعد | جنگاہ سے سبھوں کو بھگا دوں میں تو سند

صورت یہ ہوگی لشکرِ خانہ خراب کی
حالت ہوا میں ہوتی ہے جو کچھ سحاب کی[۱]

کس قدر معنی خیز، مکمل اور نادر تشبیہہ ہے جس طرح بادل کے ٹکڑے ہوا کے اشارے پر چلتے ہیں یہی حالت تیری فوج کی ہوگی۔ وہ بھی میرے اشاروں کی پابند ہوگی۔

تلوار کی تعریف :

ہیرو کی تلوار اور اس کے رہوار کی خوبیاں بیان کرنا رزم نگاری کا اہم موضوع ہے اور شعرا کے لئے جولانی طبع دکھانے کے مواقع، لیکن کام یاب شاعر کے لئے یہ ضروری ہے کہ جدت اور ندرت سے کام لے۔

وقار حضرت عباسؑ کی تلوار کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ تیغ برق دم کے محاسن بیان کرتے وقت حواسِ خمسہ گم ہیں فکر عاجز ہے اور خیال متحیر ہے۔ تلوار اوج میں ہلال سے کہیں اعلیٰ ہے قوس کا سر اس کے سامنے شرمندگی سے جھک جاتا ہے۔ تلوار کتنی متضاد خوبیوں کی حامل ہے۔

فتح و ظفر کا آئینہ بھی شعلہ رنگ بھی | طینت کی پاک و صاف بھی اور خانہ جنگ بھی
قہر و غضب کے ساتھ عدالت کا رنگ بھی | عاجز نوازیاں بھی وغا کی اُمنگ بھی

باطل پہ خشم لطف کی حق پر نگاہ بھی
دشمن بھی شرک و کفر کی اور حق پناہ بھی[۲]

تلوار دوست کی سینہ سپر ہے اور دشمن شکار۔ آبدار ہونے کے باوجود وہ

---

[۱] حوالہ بالا، بند ۴۹، ص ۱۲۸

[۲] حوالہ بالا، بند ۶۲، ص ۱۲۹

[۳] بیر الالم

خونبار و شعلہ ریز ہے اور اس کی تمنّا بھی کیا خوب ہے :

خواہش کہ جنگ سر کروں اعدا کو مار کے
دم لوں اجل کے گھاٹ پہ سب کو اتار کے

وہ تیغ آبدار کیا تھی بحرِ فنا کی ایک موج تھی ــــــ اس کی باڑھ سے تمام فوج خون میں غرق تھی

اس کو یہ اوج کیوں نصیب ہوا اس کی وجہ شاعر بتاتا ہے :

سو کی نہ اصل جانتی تھی نہ ہزار کی
ہمدم وہ اک زمانہ سے تھی ذوالفقار کی

اسی لئے ہنگامِ جنگ اس کا بھی وہی بانکپن ہے اور جان ستانی کے علم و فن سے وہ واقف ہے وہ دشمنوں کے قتل کے درپے رہتی ہے جس کو بھی اس نے تاک لیا پھر اس کے لئے جائے مفر نہیں۔ جس سمت وہ چلی کشتوں کے کشتے نظر آنے لگے اس میں سرعت اس بلا کی ہے کہ اجل بھی اس کا ساتھ نہ دے سکی ناریوں کا لہو پینے سے اس کی پیاس اور بھڑک جاتی ہے۔

رخش کی تعریف :-

مرثیہ گو شعرا نے ہیرو کی تلوار کے علاوہ اس کے رخش کی بھی خوب خوب تعریفیں کیں حضرت قاسمؑ کے رہوار کی خصوصیات ملاحظہ ہوں :

وہ تیزیٔ حسام وہ چالاکی، سمند
اُڑتے ہیں گرد جس کی نہ پا سکتے تھے پرند

رہتی تھی پیچھے تھک کے ہوا بھی دمِ زغند
تھا بے پری پہ پریوں سے ہر دا ہیں دو چند

سیماب وش قرار اسے دم بھر بھی شاق تھا
عنقا تھا راہواروں میں رشکِ براق تھا[1]

امام حسین علیہ السلام کے رخش کی تعریف میں بھی ایک بند سنتے چلئے مختلف تشبیہات دینے کے بعد شاعر اپنی عاجزی کا اعتراف کر لیتا ہے :-

ہو رقم اشہب چالاک کی کیا مدح و ثنا
پا سکے گرد قدم جس کی نہ طائر نہ ہوا

---

[1] حوالہ مذکورہ ، بند ۷۹ ، ص ۱۱۳

کیوں نہ اقرار کرے عجز کا فکرِ شعرائ   جس کی تشبیہ بھی مانند ہما ہے عنقا
یوں تو جو اہلِ سخن ہیں وہ ہوا باندھیں گے
پر جہاں وہم نہ پہنچے اسے کیا باندھیں گے[1]

رخش کی قوت کے بارے میں کس غضب کا مصرعہ ہے بار بار پڑھئے اور لطف اٹھائیے:

بار امامت کا اٹھائے ہوئے قوت ایسی

لاجواب مصرع ہے۔

میدانِ جنگ کا نقشہ:۔

مرثیوں میں معرکۂ کارزار کی مرقع کشی میں شعرا نے بڑی کاوش سے کام لیا۔ قادرالکلامی اور جزئیات کے بیان سے لڑائی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور قارئین، سامعین کچھ دیر کے لئے اپنے آپ کو اس ماحول میں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ وقار نے انیس مرحوم سے فیض حاصل کیا تھا۔ مندرجہ ذیل بند میں استاد کے رنگ کی جھلک صاف نظر آتی ہے جس میں حضرت عباسؑ کی جنگ کی کس قدر کامیاب عکاسی ہے:

سن سے جو آئی کر دیا سرکش کا سر جدا   شانوں سے ہاتھ۔ ہاتھ سے تیغ و سپر جدا
سینہ میں چاکِ قلب جدا تھا جگر جدا   پٹکے کے درمیان ہوا بندِ کمر جدا
اسوار کا جدا نہ فقط بند بند تھا
بیٹھی جو آ کے زین پہ دو پارہ سمند تھا[2]

حضرت عباسؑ کی جنگ دیکھ کر بڑے بڑے پہلوانوں کے زہرے آب ہو گئے اور ان کی نظروں کے سامنے حضرت علیؑ کی جنگ کا نقشہ پھرنے لگا:

ضربیں جری کی دیکھ کے حیران زمانہ تھا   پیشِ نگاہ جنگِ احد کا فسانہ تھا
ہر وار میں نہ سر تھا سلامت، نہ شانہ تھا   تا کا جسے وہ رن سے عدم کو روانہ تھا

---

[1] حوالہ بالا، بند ۹۱، ص ۱۶۷
[2] ایضاً ، بند ۹۳، ص ۱۳۳

ابتر تھا حال اہل عناد و فساد کا
نقشہ کھنچا ہوا تھا علیؑ کے جہاد کا[۱]

عاشور کے دن معرکۂ کارزار میں موت کا بازار گرم ہے امام حسینؑ کی جنگ الحفیظ، الامان۔ کربلا کے میدان میں ایسا رن پڑا کہ اس کی مثال زیر آسمان کہیں نہیں ملتی۔

جا پڑے غیظ میں مثل اسد اللہ جدھر
تھے پرے سارے شکستہ تو صفیں تھیں ابتر
صرصر قہر تھی یا چل رہی تھی تیغ دوسر
نخل قامت کو بناتی تھی خزاں دیدہ شجر
سر پہ سر گرتا تھا پت جھڑ کی صفت ظاہر تھی
تھی بہار اجل اور فصل حیات آخر تھی[۲]

باغیوں کا باغ تباہ و برباد ہو گیا رن میں کہیں امن و امان کا نام و نشان نہ تھا ہر طرف لاشوں کے انبار نظر آتے امام حسینؑ کی تیغ کی زد سے اعدا کی صفیں بچ نہ سکیں جو بزدل تھے وہ تو ڈر سے مرے جاتے تھے۔

محاسن :-

تشبیہات و استعارات :-

تشبیہات و استعارات شاعری کے خد و خال ہیں تشبیہہ کا مفہوم ہے معنی آفرینی وقار نے جو تشبیہات استعمال کی ہیں ان میں بالعموم جدت طرازی بھی ہے اور نزاکت تخیل بھی۔

جب نشانِ فوج پیمبر سجایا گیا تو وقار نے تشبیہات کے دریا بہا دیئے :-

اللہ رے رایتِ شہِ کونین کا جلال
کمتر تھا جس کے سامنے خورشید کا جمال
پرچم تھا یا کہ حور نے کھولے تھے سر کے بال
تھی ہر بسر علم سے عیاں شانِ ذوالجلال

۱؎ حوالہ بالا، بند ۹۶، ص ۱۳۳

۲؎ حوالہ مذکورہ، بند ۷۱، ص ۱۶۴

غل تھا نشانِ ختم رُسل کا علم ہے یہ
دامن سے تھا عیاں کہ سحاب کرم ہے یہ [1]

شہِ کونین کا علم تھا اس لیے خورشید کے جمال کی اس کے سامنے کیا حقیقت۔ علم کا پھریرا ہوا میں لہرا رہا تھا شاعر نے اسے حور کے گیسوؤں سے تشبیہہ دی۔ چھٹے مصرع میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ علم کا پرچم سحاب کرم ہے دینداروں کے لئے دنیا میں بھی اور عقبیٰ میں بھی۔

وقار کے مرثیے کا ایک اور بند پیش خدمت ہے جس میں لطیف تشبیہات کے علاوہ صنعتیں بھی قابلِ داد ہیں اور روح تغزل کی کارفرمائی بھی قابلِ ستائش ہے:

لوح وقرطاس کرے زہرہ جبیں کو محجوب
گیسوئے حور کا سطروں میں عیاں ہو اسلوب
نقطہ ہر ایک بنے خال عذارِ محبوب
حسن حرفوں کا ہو روشن گر چشم یعقوب [2]
دائرے سب پہ عیاں صورت ذوالمجد کریں
متصل صَلّ علیٰ پڑھ کے ملک وجد کریں [3]

صنائع و بدائع:-

صنائع و بدائع سے حسن کلام میں چار چاند لگ جاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ آمد ہو آورد نہ ہو ورنہ سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ یہاں چند ایسی صنعتوں کا بیان کیا جارہا ہے جو وقار نے اپنے مرثیوں میں بالعموم استعمال کیں۔

صنعت تلمیح:-

کسی مشہور قصّے، مسئلے یا مثل یا اصطلاح نجوم وغیرہ کی طرف اشارہ کیا جائے

۱ے حوالہ مذکورہ، دوسرا بند، ص ۷۹

۲ے صنعتِ تلمیح۔

۳ے خورشید خاوری۔ چھٹا بند، ص ۱۵۷

حس کو سمجھے بغیر کلام کا مطلب بخوبی ذہن نشین نہ ہوسکے" حسن حرفوں کا ہو روشن گر چشم یعقوبؑ حضرت یعقوبؑ اپنے پسر حضرت یوسفؑ کی جدائی کے غم میں اس قدر روئے کہ ان کی بصارت ضائع ہوگئی۔ جب حضرت یوسفؑ کا پیرہن (مصر سے) آیا تو آپ کی آنکھوں پر اسے رکھا گیا اور بصارت واپس آگئی۔ اسی واقعہ کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے۔

حضرت امام حسینؑ کا رجز ملاحظہ ہو جس میں صنعت تلمیح کی جلوہ گری ہے۔

کیوں ہے خیبر کی خرابی کی بھی کچھ تم کو خبر ضرب سے کس کی ہوئے حارث و مرحب بے سر
ہاتھ سے پیٹے تھے میکال و سرافیل مگر اس پہ بھی کٹ گئے جبریل امین کے شہ پر

صنعت تنسیق الصفات :۔

کسی چیز یا کسی شخص کا تذکرہ متواتر صفات سے کیا جائے۔ وقار نے اپنے ہیرو تلوار اور رخش کی تعریف میں اس صنعت کا جی کھول کر استعمال کیا۔ حضرت عباس کے بارے میں فرماتے ہیں :

جرّار و سرفروش و شجاع و وفا شعار خود شیر اور لخت دل شیر کردگار

رخش کی مختلف صفات کا تذکرہ وقار نے اپنے مرثیوں میں کیا ہے :

وہ آنکھ جس کا مثل نہ آئے کبھی نظر آہو شکار، شیر فگن، تیز و پر جگر

صنعت ترصیع :۔

شاعر ایک مصرع موزوں کرے اور اس کے مقابل دوسرا اس طرح ہو کہ پہلے مصرع کا پہلا لفظ دوسرے مصرع کے پہلے لفظ کا ہم وزن و ہم قافیہ ہو۔ اسی طرح پہلے مصرع کا دوسرا لفظ دوسرے مصرع کے دوسرے لفظ کا قافیہ ہو گویا پہلے مصرع کے الفاظ بھی ترتیب وار دوسرے مصرع کے الفاظ کا قافیہ ہوں :۔

ہر گل میں وقت دید تھی پیدا نئی بہار سب رنگ مجتمع تھے کہاں تک کروں شمار
پر بے محل نہ ایک بھی تھا ان میں زینہار صانع نے کی تھی صنعت ترصیع آشکار[1]

---

[1] حوالہ بالا، ص ۱۰۵

یہاں صنعت ترصیع کا یہ مفہوم ہے کہ ہر گل میں نئی بہار تھی اور ہر پھول مختلف رنگ و بو کا تھا۔ سارا باغ آراستہ و پیراستہ تھا۔ چمن ایک گلدستہ بنا ہوا تھا جس سے صانع کی صنعت نمایاں تھی۔

صنعت حسن تعلیل:

شاعر ایک چیز کو کسی چیز کی صفت یا علت بتاتا ہے حالانکہ دراصل وہ اس کی علت نہیں ہوتی۔ شاعر دراصل کسی بات کی توجیہہ کرتا ہے اور اس کی ایسی علت بیان کرتا ہے جو اس کی علت نہیں، مثلاً:۔

دو دن سے تھا جو مالکِ کوثر نہر یاب ساحل پہ سر ٹپکتی تھیں موجیں بہ اضطراب

یہ عام مشاہدہ ہے کہ ساحل تک موجیں آتی ہیں اور اپنا سر ٹکراتی ہیں اور یہی ان کی زندگی کا خاتمہ ہے شاعر اس کی یہ وجہ بیان کرتا ہے کہ چوں کہ امام حسینؑ پر پانی بند کر دیا گیا تھا اسی لئے نہر کو اضطراب [1] تھا۔

صنعت طباق و تضاد:۔

جب دو متضاد چیزوں کا تذکرہ ایک مصرع یا شعر میں آئے لیکن خوبی یہ ہو کہ اس میں برجستگی ہو:

بجلی ہو کند تیغِ زبان ایسی تیز ہو پھر آج سب کو یادِ علیؑ کی ستیز ہو

کند اور تیز دو مختلف خصوصیات وقار نے نہایت سلیقے سے ایک مصرع میں جمع کر دیں۔

زبان:۔

مرثیے کے موضوع میں تنوع ہونے کی وجہ سے اس کی زبان میں بھی موقع اور محل کی

---

[1] اسی مفہوم کو انیس مرحوم نے بھی خوب ادا فرمایا:

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی ساحل پہ سر ٹپکتی تھیں موجیں فرات کی

مناسبت کا خیال رکھنا ضروری ہے اور جذبات نگاری یا وعظ و پند کے لئے سادہ اور سلیس زبان زیادہ موزوں ہے منظر نگاری اور سراپا کے بیان ، رزمیہ شاعری ، رجز اور رخش کی تعریف میں پرشکوہ الفاظ استعمال کرنے چاہئیں ۔ رزمیہ شاعری ایک قسم کی کسوٹی ہے جس سے ایک قادر الکلام شاعر ہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے ۔ تشبیہات اور استعارات کے بیان کے لئے جدت اور ندرت کے علاوہ ایسی زبان ضروری ہے جو مفہوم کو باآسانی واضح کر سکے ۔

وقارؔ کے مرثیوں کا ایک سرسری جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ :-
وہ ایک کامیاب مرثیہ گو ، شاعر گزرے ہیں ان کے مرثیوں میں میر انیسؔ مرحوم کا رنگ نمایاں ہے ۔ بعض مصرع بیت یا بند ایسے ہیں جن کو پڑھ کر یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ انیسؔ نے لکھے یا وقارؔ نے ۔ وقارؔ کا کلام الفاظ و معانی کا ایک شگفتہ اور شاداب گلشن ہے جو آسیبِ خزاں سے محفوظ رہے گا ۔ ان کے کلام میں اعجاز بیانی بھی ہے اور رعنائی خیال بھی ، خلوص و صداقت بھی ہے اور تاثیر بھی ، لفظاً اور معنیً وہ فصاحت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے بلاغت کا انداز لئے ہوئے ہے ۔" نکتہ داں " نکتہ سنج ، نکتہ شناس ارباب کے لئے دعوتِ فکر و نظر ہے ۔

عرضِ ناشر

پیر محمد ابراہیم ٹرسٹ نے عوام کے فائدے کے پیش نظر یہ ذمہ داری لی ہے کہ انکی خدمت میں ایسا لٹریچر پیش کیا جائے جو انسان کی جسمانی دماغی اخلاقی اور روحانی ضروریات کا کفیل ہو وہ ہیجان انگیز مواد جو آجکل ادبی تخلیق کے نام سے عموماً پیش کیا جارہا ہے اسکے نتیجہ میں نہ صرف خانگی طور پر بے راہ روی ظہور پذیر ہو رہی ہے بلکہ معاشرہ کی بیرونی مجموعی فضا اور سرگرمیوں پر بھی اس آزاد بے راہ روی کے اثرات نمایاں ہوتے جارہے ہیں۔ اگر صورت حال کو بغور کسی روک تھام کے مزید پھولنے پھلنے کا موقع دیا گیا تو انجام کار ساری زمین ایک شعلہ فشاں جہنم بن کر رہ جائیگی جیسا کہ آجکل نام نہاد مہذب مغربی ممالک میں معصیت کی بڑھتی ہوئی رفتار کا نتیجہ ہمارے پیش نظر ہے یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں بھی "تہذیب کیطرف بازگشت" کا خیال سنجیدہ طبقوں میں ایک تاکیدی لفظ کی حیثیت اختیار کرتا جارہا ہے۔

اسی خیال کے پیش نظر مندرجہ بالا ٹرسٹیوں نے اس بات کا بیڑا اٹھایا ہے کہ پبلک کے سامنے ایسا لٹریچر پیش کیا جائے جو نہ صرف روز بروز بڑھتے ہوئے غیر سماجی لٹریچر کے تباہ کن اثرات کے ازالہ کا باعث بنے بلکہ ان میں صحت مند ادب کا ذوق پیدا کرے۔

ٹرسٹ کے شائع کردہ کتابوں اور انکی لاگت سے بھی کم قیمتوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بخوبی واضح ہو جائیگا کہ ٹرسٹ یہ کارِ خیر کسی تجارتی مفاد کی خاطر نہیں کر رہا ہے۔ یہ لاگت سے کم قیمت صرف اسلئے رکھی گئی ہے کہ مفت تقسیم کردہ کتابیں عوام کی نظر میں وقیع نہیں ٹھہرتیں۔

ٹرسٹیوں کو اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ انکی کتابوں میں انتہائی احتیاط کے باوجود غلطیاں رہ سکتی ہیں کیونکہ کسی موضوع پر ہمہ دانی کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا۔ بہرحال ہم اپنے قارئین کو اس امر کا یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ٹرسٹ کی پیشکردہ کتابوں میں ہم ہمیشہ بہترین مقاصد پبلک کی فلاح بہبود اور معبودِ حقیقی کی خوشنودی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اگر ہماری پیش کردہ کتابوں میں مذکورہ مقاصد کے خلاف کوئی چیز نظر آئے تو محترم قارئین سے ہماری گذارش ہے کہ اس سے ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ ہم حتی المقدور اسے دور کرنیکی کوشش کریں۔

ٹرسٹیز
پیر محمد ابراہیم ٹرسٹ کراچی نمبر ۵